ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مضامین کا مجموعہ

مقالاتِ حکیم

جلد اوّل : اسلامیات

مرتّبہ

شاہد حسین رزاقی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ۔ لاہور۔ پاکستان

پاکستان کے نامور مفکر اور بلند پایہ مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نہایت دقیق مسائل اور مشکل موضوعات پر عام فہم انداز اور سادہ الفاظ میں اظہار خیال کرنے پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے ۔ اسلامیات ، فلسفہ اور اقبالیات پر ان کی نظر نہایت وسیع تھی اور علمی حلقوں میں ان کی تصانیف بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں ۔ کتابوں کے علاوہ خلیفہ صاحب نے مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں مضامین بھی لکھے جن کا مطالعہ ان کے افکار و نظریات سے پوری طرح باخبر ہونے کے لیے ضروری ہے ۔ چنانچہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ نے ان کے اُردو اور انگریزی مضامین اور تقاریر شائع کرنے کا ایک جامع پروگرام بنایا ہے ۔

خلیفہ صاحب کے اُردو مضامین تین جلدوں میں "مقالات حکیم" کے نام سے شائع کیے گئے ہیں ۔ پہلی جلد میں اسلامیات اور دوسری میں اقبالیات سے متعلق مضامین ہیں اور تیسری جلد متفرق مضامین و تقاریر پر مشتمل ہے ۔ پیش نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے جس میں اسلامی تعلیمات اور اسلام کے سیاسی ، اقتصادی اور معاشری تصورات پر فکر انگیز مقالات شامل کیے گئے ہیں ۔ خلیفہ صاحب اس نظریہ کے حامی تھے کہ اسلامی افکار کی از سر نو تشکیل کر کے اسلام کی اساسی قدروں اور عصری تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اسلام کے عالمگیر اور ترقی پذیر اصول ساری دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیے جائیں کہ اسلام ایک ساکت اور جامد مذہب نہیں بلکہ ایک متحرک دین اور حیات بخش قوت ثابت ہو ۔ اس بنیادی مقصد کو انھوں نے اپنے مضامین میں بھی پوری طرح ملحوظ رکھا ہے جو ان کے علمی تبحر ، خدا داد ذہانت اور معنی آفریں صلاحیت کے آئینہ دار ہیں ۔

6/50 روپے

مقالاتِ حکیم

جلد اوّل

اسلامیات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مضامین کا مجموعہ

مرتّبہ

شاہد حسین رزاقی

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ۔ لاہور

طبع اول ۱۹۵۹ء

تعداد ایک ہزار

طابع و مطبع

حمایت اسلام پریس لاہور

ناشر

محمد اشرف ڈار، سکرٹری ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

کلب روڈ۔ لاہور

تعارف

پاکستان کے نامور فلسفی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم بلند پایہ مصنف، صاحب طرز ادیب، خوش بیان مقرر، خوش گو شاعر اور روشن خیال مفکر تھے۔ اور ان کے افکار و نظریات پاکستان کے مسلمانوں کی فکری تاریخ کا ایک اہم باب بن گئے ہیں۔ خلیفہ صاحب اپنے عہد کے ذہین ترین افراد میں سے تھے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ ممتاز رہے اور عمر کے آخری پچاس سال میں جوان کی زندگی کا اہم ترین دور ثابت ہوئے ان کے قلم کے جوہر کھلے اور انھوں نے روشن خیال مفکروں میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔

خلیفہ صاحب کشمیری نژاد تھے۔ جولائی ۱۸۹۳ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اور اسی شہر میں میٹرک تک تعلیم پائی۔ پھر علی گڈھ چلے گئے اور ۱۹۱۲ء میں الیف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخل ہوئے۔ کیونکہ ان کو فلسفہ سے غیر معمولی دلچسپی ہو گئی تھی اور اس کالج میں اس مضمون کی تعلیم کا اچھا انتظام تھا۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں وہ پنجاب یونیورسٹی میں اوّل رہے اور ان کی خداداد صلاحیتیں ایک تابناک مستقبل کی نشاندہی کرنے لگیں۔ ۱۹۱۷ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد لاہور واپس آئے اور ایل ایل بی کی سند حاصل کر لی لیکن وکالت سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور وہ ایسے کام کی تلاش میں تھے جو ان کے فطری رجحان کے مطابق ہو۔ یہ کام ان کو جلد ہی مل گیا۔ حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی اور اگست ۱۹۱۹ء میں خلیفہ صاحب فلسفہ کے مددگار پروفیسر کی حیثیت سے اس یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ حیدرآباد میں ملازمت شروع ہونے کے دو سال بعد ہی وہ تعلیمی رخصت لے کر جرمنی چلے گئے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر ۱۹۲۵ء میں جب حیدرآباد واپس آئے تو ان کو یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر اور صدر شعبہ بنا دیا گیا۔ حیدرآباد میں خلیفہ صاحب تیس سال رہے۔ ۱۹۴۲ء میں طویل رخصت لے کر کشمیر چلے گئے تھے جہاں وہ مہاراجہ کالج کے پرنسپل اور

پھر محکمہ تعلیم کے ناظم مقرر ہو گئے تھے۔ وہ سری نگر میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن وہاں کے حالات سے مطمئن نہ ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں پھر حیدر آباد واپس آگئے۔ اور یونیورسٹی میں میرِ شعبۂ فنون مقرر ہوئے۔

۱۹۴۹ء میں خلیفہ صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو کے پاکستان آگئے۔ یہاں انھوں نے ۱۹۵۰ء میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ قائم کیا اور آخر وقت تک اس کے ڈائرکٹر رہے۔ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ خلیفہ صاحب کی نظر میں غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا اور انھوں نے اپنی فکری و علمی صلاحیتیں اس ادارے کے لیے وقف کر دی تھیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اسلامی افکار کی از سرِ نو تشکیل کر کے اسلام کی اساسی قدروں اور عصری تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اور اسلام کے عالمگیر اور ترقی پذیر اصول ساری دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیے جائیں کہ اسلام ایک ساکت و جامد مذہب نہیں بلکہ ایک متحرک دین اور حیات بخش قوت ثابت ہو۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے انھوں نے یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ اور اسی مقصد کو انھوں نے اپنی تصانیف میں ملحوظ رکھا۔

پاکستان کی علمی، ادبی، ثقافتی، دینی اور معاشرتی سرگرمیوں میں خلیفہ صاحب ہمیشہ نمایاں حصہ لیتے رہے۔ پاکستان فلاسفیکل کانگریس قائم کی اور اس کے صدر ہوئے۔ تنظیم زکوٰۃ کمیٹی کے صدر اور عائلی کمیشن کے سکریٹری مقرر کیے گئے۔ علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں سے ان کا قریبی تعلق رہا اور ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۵۷ء میں ایل ایل۔ ڈی کی اعزازی ڈگری دی۔

موجودہ زمانہ میں اشتراکیت نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی ہے اور ہر ایسے نظامِ حیات کے لیے جو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور روحانی اقدار کا قائل ہے اشتمالیت کو ایک خطرہ تصور کیا جانے لگا۔ چنانچہ امریکہ میں عالمی برادری اور مسلم مسیحی، فاو کی تحریکیں اسی غرض سے شروع کی گئی ہیں کہ ملک، مذہب، ملت، رنگ اور زبان کے امتیازات سے بالاتر ہو کر تمام انسانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔ اور اشتراکی مادہ پرستی اور لادینی کا مقابلہ کرنے کے لیے خدا پرست مذاہب کے ماننے والے متحد ہو جائیں۔

خلیفہ صاحب ان تحریکوں کے حامی تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۴ اور ۱۹۵۶ء میں وہ لبنان میں ہونے والے بین الاقوامی مذاکروں میں شریک ہوئے۔ اور ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۶ء میں امریکہ، کنیڈا اور یورپ کے متعدد ممالک کے دورے کر کے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو اہلِ کلیسا کی تنگ نظری اور صلیبی جنگوں کی وجہ سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں پیدا ہو گئی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں خلیفہ صاحب دانشوروں کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے آسٹریلیا بھی گئے تھے۔ ۱۹۵۹ء میں کراچی میں بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی تھی۔ خلیفہ صاحب اس کے ایک اجلاس کی صدارت کے لیے کراچی گئے تھے۔ اور وہیں ۳۰ جنوری کو انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

کم و بیش چالیس سال تک خلیفہ صاحب تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہے، اور عمر کے آخری دس سال ان کی علمی زندگی کا بہترین دور تھے۔ حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو زبان ذریعۂ تعلیم تھی۔ اور اعلیٰ جماعتوں کی تعلیم کے لیے اردو میں مختلف مضامین کی کتابوں کی فراہمی ایک اہم مسئلہ تھا۔ چنانچہ دوسری زبانوں سے عمدہ کتابوں کا ترجمہ کرانے پر خاص توجہ کی گئی۔ اس کام میں خلیفہ صاحب نے نمایاں حصہ لیا۔ اور وبیر کی ہسٹری آف فلاسفی (تاریخ فلسفہ) ہیرالڈ ہوفڈنگ کی ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی (تاریخ فلسفۂ جدید) اور ایڈورڈ زیلر کی آؤٹ لائن آف گریک فلاسفی (مختصر تاریخ فلسفۂ یونان) کا ترجمہ کیا۔ تراجم کی فہرست میں ولیم جیمز کی مشہور کتاب کا ترجمہ بھی شامل ہے جو ۱۹۵۸ء میں نفسیاتِ وارداتِ روحانی کے نام سے شائع ہوا۔ ان کتابوں کے علاوہ خلیفہ صاحب نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران خلیفہ صاحب نے داستانِ دانش کے نام سے فلسفہ کی سرگذشت دلچسپ انداز میں لکھی تھی جو ان کی انشا پردازی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

خلیفہ صاحب کی تصنیفی زندگی کا بہترین دور پاکستان آنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں

شروع ہوا اور دس سال تک جاری رہا۔ اس دور کی نہایت اہم کتاب اسلامک آئیڈیالوجی ہے جس میں اسلام کے بنیادی اصولوں کو جدید افکار کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے اور اسلامی نظریۂ حیات کا دوسرے نظام ہائے فکر سے مقابلہ کرکے دعوتِ فکر و نظر دی گئی ہے اور مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ خلیفہ صاحب کی دوسری مشہور انگریزی تصنیف اسلام اینڈ کمیونزم ہے جس میں انھوں نے اسلامی اور اشتراکی نظریات کا تقابلی مطالعہ اور تجزیہ کرکے اسلام کو مسلکِ اعتدال ثابت کیا ہے اور اس کے نظریات کی خصوصیات واضح کی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے شائع کی ہیں۔

مولانا جلال الدین رومی سے خلیفہ صاحب کو گہرا شغف تھا۔ ۱۹۱۷ء میں ایم۔ اے کے لیے اس موضوع پر مقالہ لکھا تھا اور ۱۹۲۴ء میں پی ایچ۔ ڈی کے لیے بھی میٹافزکس آف رومی کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا جو ۱۹۳۳ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ سے ۱۹۵۳ء میں حکمتِ رومی اور ۱۹۵۹ء میں تشبیہاتِ رومی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ حکمتِ رومی میں خلیفہ صاحب نے رومی کے افکار و نظریات کی روحانی و فکری اہمیت بڑے دلکش انداز میں بیان کی ہے اور تشبیہاتِ رومی میں انھوں نے رومی کے افکار کو تشبیہ و تمثیل کے آئینہ میں دیکھا ہے اور اخلاقی و روحانی مسائل کو سمجھانے کے لیے رومی کی یقین آفرین تشبیہات کے تخلیقی و روحانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

خلیفہ صاحب میرزا غالب کے بڑے قدرشناس تھے اور افکارِ غالب لکھ کر انھوں نے غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر حکیمانہ بحث کی اور اس کے فلسفیانہ افکار کو جو اشعار میں منتشر ہیں مربوط طریقہ سے پیش کرکے انھیں ایک نظامِ فکر کی شکل دینے کی کوشش کی۔

عصرِ حاضر کے عظیم ترین شاعر اور مفکر علامہ اقبال کے حکیمانہ اندازِ فکر، حسنِ

بیان اور نظریات سے خلیفہ صاحب بے انتہا متاثر تھے۔ اور ان کی مشہور تصنیف فکرِ اقبال اس موضوع پر ایک مستند ترین کتاب ہے۔ اس میں اقبال کی شاعری اور فلسفہ کے تمام پہلوؤں پر فکر انگیز بحث کی ہے اور اقبالیات میں یہ گراں قدر اضافہ اردو ادب کو خلیفہ صاحب کا بیش بہا تحفہ ہے۔

خلیفہ صاحب اعلیٰ درجہ کے مفکر اور دانش ور تھے۔ بہت جلد بات کی تہ کو پہنچ جاتے تھے پیچیدہ مسائل اور مشکل موضوعات پر عام فہم انداز اور سادہ الفاظ میں اظہارِ خیال پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ نہایت دقیق فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کرتے وقت ان کی خداداد ذہانت اور معنی آفریں صلاحیت کے جوہر کھلتے تھے۔ ان کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا۔ اردو اور فارسی ادب سے ان کو دلی لگاؤ تھا اور انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادب پر بھی ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ ان کی یہ خوبیاں اور علم و فضل کی وسعت و گہرائی ان کی تصانیف میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

کتابوں کے علاوہ خلیفہ صاحب نے مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں مضامین لکھے اور تقریریں بھی کیں جن کا مطالعہ ان کے افکار و نظریات سے پوری طرح باخبر ہونے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ (لاہور) نے ان کے اردو اور انگریزی مضامین و تقاریر اور ان کا مجموعۂ کلام شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اردو مضامین مقالاتِ حکیم کے نام سے تین جلدوں میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ پیشِ نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے اور اسلامیات سے متعلق مضامین اس مجموعہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ دوسری جلد اقبالیات سے متعلق ہے اور تیسری جلد متفرق مضامین وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان تین جلدوں کے علاوہ انگریزی مقالات کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا جا رہا ہے اور ان کے کلام کا مجموعہ بھی زیرِ ترتیب ہے۔ یہ دونوں کتابیں جلد ہی شائع ہو جائیں گی پیشِ نظر مجموعہ میں جو مضامین ہیں وہ زیادہ تر ادارہ کے ماہنامہ ثقافت کے لیے لکھے

گئے تھے۔ خلیفہ صاحب کے مضامین پاکستان اور ہندوستان کے بہترین رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ جو ان موقر جرائد اور ریڈیو پاکستان، لاہور کی مہربانی سے مجموعوں میں شامل کیے گئے ہیں۔ مقالاتِ حکیم کی دوسری جلدیں بھی عنقریب شائع ہو جائیں گی۔ امید ہے کہ مرحوم خلیفہ صاحب سے متعلق کتابوں کا یہ سلسلہ علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

(ش۔ ح۔ ر)

فہرست

"اسلام کی نشاۃِ ثانیہ نہ مغرب کی کورانہ تقلید سے ہو سکتی ہے اور نہ ان فرسودہ اصولوں اور طریقوں سے چمٹے رہنے سے جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کے اساسی اصولوں پر غور کریں اور ان پر عمل پیرا ہوں، اور اس احساسِ کمتری کو ختم کر دیں جس میں وہ مبتلا ہو گئے ہیں اور جو مغرب کی پیش کردہ ہر چیز کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے پر انھیں مجبور کرتی ہے۔ مسلمان قوموں بلکہ مغرب کو بھی اسلام سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اسلام میں حریت، اخوت اور مساوات کے تصورات نہایت ترقی پذیر اور حقیقی ہیں، اور ضرورت ہے کہ ان کو ٹھیک طرح سمجھا اور ان پر عمل کیا جائے۔ مغرب کا معاشرتی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ کیا ہم اپنے نظامِ حیات کی نئی عمارت ان شکستہ عمارتوں کے ملبے سے تعمیر کرنا چاہتے ہیں جو ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے منہدم کی جا رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دنیا کی ہدایت اور نشاۃِ ثانیہ کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم اسلام کے پیش کیے ہوئے زندگی کے عالمگیر اصولوں کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں۔"

خلیفہ عبدالحکیم

اسلام کی اساس

ہر نظریۂ حیات ایک بنیادی عقیدے پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ بنیادی عقیدہ اصل یا جڑ ہوتا ہے، اس جڑ میں سے جو درخت اُگتا ہے، اس میں بے شمار شاخیں نکلتی ہیں اور ہر شاخ میں سے کثیر تعداد میں پتے نکلتے ہیں۔ یہ اصل ثابت اور قائم ہوتی ہے۔ شاخیں اور پتے سوکھتے اور جھڑتے ہیں، ان پر خزاں اور بہار کا عمل ہوتا ہے۔ فروع میں تجدد و تغیر درخت کی حیات کے بقا و ارتقا کا باعث ہوتا ہے روحانی زندگی کو بھی قرآن کریم نے ایک درخت ہی سے تشبیہ دی ہے جس کی اصل ثابت رہتی ہے اور اس کی فروع زمین سے لے کر آسمان تک پھیلتی ہیں۔

عقیدۂ توحید

سوال یہ ہے کہ وہ کلمۂ طیبہ کیا ہے، جو اس طرح کا ثبات و دوام رکھتا ہے۔ یہی کلمہ اصل دین اور اصل اسلام ہوگا۔ یہی وہ حقیقتِ حیات ہوگا جس سے تمام ہستی کی توحید ہو سکے اور وجودِ حقیقی اور ارتقائے حیات کا ضامن بن سکے۔ یہ کلمہ ایسا ہونا چاہیے جس کا عقیدہ عقل اور فطرت اور مشاہدے کی شہادت سے استوار ہو۔ جو کسی فرد کا تصوّر یا وہم نہ ہو جس پر یقین کرنے کے لیے کورانہ اعتماد کا تقاضا نہ کیا جائے جو فطرت کی گہرائیوں میں سے ابھرے اور فطرت کے مناظر و حوادث ہر قدم پر اس کی توثیق کرتے رہیں۔ فطرت کے تمام تقاضے اس سے بطریق احسن پورے ہو سکیں۔ یہ عقیدہ ہر قسم کی حکمت کی اساس ہو، تمام مسائلِ حیات کی گتھیاں اس سے سلجھ سکیں۔ حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی یا علم اور اخلاق کے اصول اس سے منضبط ہو سکیں۔ زندگی کی لا متناہی کثرت اس ایک کلمے کی وحدت میں پروئی جا سکے۔ وہ کلمہ زندگی کے اوراقِ پریشاں کا شیرازہ بند ہو۔ اس کے اندر جو حقیقت مضمر ہو وہ حیاتِ جسمانی، حیاتِ مادّی، حیاتِ اخلاقی اور حیاتِ روحانی سب پر حاوی اور سب میں جاری و ساری ہو۔ از روئے اسلام یہ عقیدہ یا کلمۂ طیبہ توحید ہے۔ قرآن نے اسی کو اصلِ دین

قرار دیا ہے۔ دین کے باقی تمام ارکان، تمام شریعت، تمام شعائر، تمام عبادات، تمام اصولِ معاش اور عقائدِ معاد اس ایک عقیدے کی شاخیں اور پتے ہیں۔

شرائع میں اختلاف اور تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ عبادت کے طریقے کم و بیش مختلف ہو سکتے ہیں، اخلاقی اصول کے ہنگامی اطلاق میں اضافی تغیر ہو سکتا ہے، سیاست کے انداز حالات کے تغیر کے ساتھ بدل سکتے ہیں، لیکن اس کلمہ طیبہ اور اس اصل ثابت میں کوئی بنیادی تغیر نہیں ہو سکتا۔ تمام قرآن شرک کے خلاف ایک مسلسل جہاد اور توحید کے دلائل کی تکرار ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اگر یہ عقیدہ کسی کے دل میں اچھی طرح گھر کر جائے تو وہ حقیقتِ حیات سے آشنا ہو جاتا ہے، باقی تمام ثانوی حقائق ایک منطقی لزوم کے ساتھ اس میں سے خود بخود سرزد ہوں گے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے علاوہ اس کی تائید میں بعض صحیح احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول کریمؐ اسی عقیدے کو بنیادِ دین اور عین دین سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں دو احادیث خاص طور پر روشنی ڈالتی ہیں، ایک کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں کہ رسول کریم نے ان کو اپنی نعلین مبارک دیں اور فرمایا کہ جاؤ اس کا اعلان کر دو کہ جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اس کی نجات ہو گئی۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت ابوذرؓ سے کہا کہ من قال لا الٰہ الا اللہ فدخل الجنۃ جس نے توحید کا اقرار کیا کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ ابوہریرہؓ کے سپرد کردہ پیغام کے عوام تک پہنچانے میں حضرت عمر فاروقؓ حائل ہوئے، اور دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کو اس تعلیم نے جھنجوڑ دیا۔ واقعہ یہ نہیں تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نعوذ باللہ اس کو درست نہ سمجھتے تھے۔ ان کو فقط یہ خطرہ ہوا کہ عوام میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھیں گے کہ لا الٰہ الا اللہ کہا اور چھٹی ہو گئی۔ محض اقرار باللسان کو کافی اور مکتفی سمجھ لیں گے، اور اسلام جو نظامِ اخلاق اور ضابطۂ شریعت قائم کرنا چاہتا ہے، اس کو اختیاری یا غیر ضروری سمجھ کر اس کی طرف سے غافل ہو جائیں گے۔ اگر توحید اقرار باللسان سے تصدیق بالقلب تک جا پہنچے تو اس شخص کی نظر میں اور

اس کے نتیجہ کے طور پر اس کے عمل میں بھی ضرور ایک حیرت انگیز انقلاب ہوگا، اور پوری اسلامی زندگی خود بخود اس میں سے شاخوں اور پتوں کی طرح پھوٹ پڑے گی، یہ بات سرسری زبانی اقرار سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ حضرت عمر فاروقؓ کو بجا طور پر یہ خطرہ محسوس ہوا کہ سست عمل لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور ممکن ہے کہ بعض بد عمل لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو جائیں، کہ توحید کا اقرار ہمارے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ کی مصلحت بینی پر رسول کریمؐ معترض نہیں ہوئے۔ حضرت ابوذرؓ کو یہ اعلان سن کر ایک دوسری طرح کا دھڑکا محسوس ہوا۔ وہ بجا طور پر اخلاقی عمل کو عقیدۂ توحید سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے براہِ راست رسول کریمؐ سے دو کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا اور پوچھا کہ توحید کا اقرار کرنے والا، اگر چوری کرے یا زنا کا مرتکب ہو، تو کیا پھر بھی اس کی نجات ہو جائے گی۔ اس پر رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ہاں پھر بھی ہو گی۔ یہ جواب سن کر حضرت ابوذر اور زیادہ پریشان ہوئے۔ دوبارہ پوچھا، پھر جواب ملا کہ ہاں، تیسری دفعہ پھر اپنے شک کو اضطراب کے ساتھ دہرایا جس پر رسول اکرمؐ نے کسی قدر ناراض ہو کر فرمایا کہ ہاں حقیقت یہی ہے جو میں کہہ چکا ہوں علی رغم انف ابی ذر۔

جس طرح حضرت ابوذر اس سے پریشان ہوئے اسی طرح اکثر مومن آج تک اس سے مضطرب ہوتے ہیں، ہمارے نزدیک اس کی سادہ توجیہہ یہی ہے کہ از رُوئے تقاضائے بشریت کسی وقت ایک موحد سے بھی معمولی کوتاہیوں سے بڑھ کر بڑے گناہ بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ تمام موحدوں اور مومنوں کا ایمان اپنی قوت اور بصیرت کے لحاظ سے ایک درجے کا نہیں ہوتا۔ انبیا اور اولیا سے چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، کیونکہ خطا و نسیان بشریت کا تقاضا ہیں، لیکن ان کی روحانی بلندی اور استقامت کی وجہ سے کبائرِ اثم کا سرزد ہونا، ان کی فطرت کے لیے ایک امرِ محال ہو جاتا ہے۔ عام موحدوں کا درجہ اس سے بہت پست ہوتا ہے۔ اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ عادی سارق اور عادی زانی نجات یافتہ ہو سکتے ہیں۔ اس کا مطلب

صرف یہ ہے کہ کبھی کبھار ایک مومن موحد سے بھی اس قسم کی لغزش سرزد ہو سکتی ہے۔ اگر وہ واقعی مومن ہے تو وہ پشیمان اور تائب ہوگا، خدا کے ہاں سچی توبہ کی قبولیت کا وعدہ ہے۔ اس کی عارضی لغزش سے اس شخص کی سیرت مستقل طور پر خراب اور تاریک نہیں ہوگی جس کی سیرت میں توحید سرایت کر چکی ہے، وہ خدا کی رحمت سے بہرہ اندوز ہے۔ توحید سے انسان کی طبیعت میں ایک فطری راستی پیدا ہو جاتی ہے۔ سیدھی نرم لکڑی کو خارجی دباؤ سے عارضی طور پر تھوڑا بہت جھکا سکتے ہیں لیکن جب وہ دباؤ ہٹ جائے تو وہ خود بخود اپنی راستی پر واپس آ جاتی ہے۔ غفران اور رحمت الٰہی سیرت ہی پر عمل کر سکتے ہیں۔

مذکورہ صدر احادیث کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کو اصل دین قرار دیتا ہے اور اس عقیدے کی اہمیت کو تمام دیگر اعمال کے مقابلے پر زیادہ اساسی تصور کرتا ہے۔ تمام رسالت اسی عقیدے کی توضیح اور تقویت کا ذریعہ ہے۔

توحید اور حکمت

قرآن کریم اپنے آپ کو حکمت کی کتاب قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ حکمت سب سے بڑی نعمت ہے ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا۔ نبی کو بھی یہ حکم دیتا ہے کہ انسانوں کا تزکیہ نفس کر، ان کو یہ کتاب پڑھ کر سنا اور سمجھا اور اس تعلیم میں جو حکمت ہے، اس کو ان پر آشکار کر۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ حکمت کیا چیز ہے اور توحید کے عقیدے کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ بعض اور الفاظ بھی ہیں، جو لفظ حکمت کے قریب قریب مرادف شمار ہوتے ہیں، علم، معرفت یا عقل اور اہل مغرب کے ہاں سائنس کی اصطلاح۔ مغربی حکیمانہ انداز فکر کو سائنٹیفک کہتے ہیں۔ علم و عقل کہیں یا حکمت اور سائنس، دیکھنا یہ ہے کہ یہ کس انداز تفکر کا نام ہے۔ کیا یہ کوئی نظری میلان یا جبلی پیاس ہے۔ اس کی ماہیت کیا ہے، اس کا مقصود کیا ہے، اس کے اندر کیا بات ہے جس کی وجہ سے دین اس کو خیر کثیر کہتا ہے۔ قرآن کریم طرح طرح سے اس کی تلقین کرتا ہے کہ تدبر و تفکر اور تعقل سے کام لو۔ عقل سے کام نہ لینے والوں کو، جانوروں سے

پست درجہ دیتا ہے۔ ان کو گونگے، بہرے اور اندھے کہتا ہے۔ مشاہدۂ کائنات پر بڑا زور دیتا ہے۔ اسلام اس کا قائل ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اس میں تمام حوادث آئین کے زیرنگین، علت اور معلول کی کڑیاں ہیں۔ کوئی واقعہ عبث یا باطل نہیں ہوتا۔ جس کو محض اتفاق کہتے ہیں اس کا وجود کہیں کائنات میں نہیں۔ مشیت الٰہی اور حکمت الٰہی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اسلام سے قبل تمام مذاہب نے خوارق عادت یا معجزات و کرامات کو خدا کی خدائی اور رسولوں کی رسالت کی حقانیت کا واحد ثبوت سمجھ لیا تھا اور یہ عقیدہ قائم کر لیا تھا کہ دین اور حکمت دو الگ الگ بلکہ متضاد چیزیں ہیں۔ دین کا تعلق مشاہدے اور عقل سے نہیں بلکہ بعض ان دیکھی باتوں کو محض اعتبار پر مان لینا ہے۔

یہ تعلیم ادیان میں سب سے پہلے اسلام نے دی کہ فطرت کا مدار سنت اللہ پر ہے اور سنت اللہ میں کوئی تبدل و تغیر نہیں ہوتا۔ فطرت کے ثابت و قائم قوانین ہی سنت اللہ ہیں لیکن فطرت اللہ اتنی ہی نہیں ہے جو حواس کو محسوس ہوتی ہے یا عقلِ جزوی یا عقلِ منطقی کی گرفت میں آتی ہے۔ اگر فطرت اللہ لامحدود ہے تو ہژدہ ہزار عالموں میں بھی کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی جس کو فوق الفطرت کہہ سکیں ہماری محدود فطرت اور محدود نظر کے لیے تو حاضر کم ہے اور غائب زیادہ۔ حاضر محدود ہے اور غائب لامحدود۔ لیکن خدائے بصیر و علیم کے ہاں تو سب کچھ حضور ہی حضور ہے۔ ظلمت کہیں نہیں نور ہی نور ہے۔ جو غیب ہمارے لیے غیب ہے وہ خدا کے لیے ازلی اور ابدی طور پر حاضر ہے۔ تمام فطرت لامتناہی ایک خدائے واحد کی شان کا مظہر ہے۔ فطرت میں ہر چیز کا ہر دوسری چیز کے ساتھ براہ راست یا بالواسطہ ربط ہے۔

انسان کی عدم معرفت اور تنگ نظری نے جب فطرت کا مشاہدہ کیا، تو اس کو حوادث کی کثرت نظر آئی۔ ان حوادث میں اس کو کوئی باہمی ربط نظر نہ آیا۔ وہ آگ کو ایک الگ حقیقت سمجھا اور پانی کو الگ۔ ہر واقعہ کو کسی ایک قادر مگر متلون ہستی

کے ساتھ منسوب کردیا۔ تینتیس کروڑ عناصر و مظاہر و حوادث کے تینتیس کروڑ دیوتا بنا ڈالے اور یہ دیوتا بھی کوئی منظم جماعت نہ تھے۔ دیوتا ایک دوسرے سے حسد اور بغض رکھنے والے، ایک دوسرے سے متصادم اور برسرِ پیکار اور ان سب کے مقابلے میں انسان حقیر اور بے اختیار۔ اشرف المخلوقات اسی شرک کی وجہ سے احسن تقویم کے مرتبے سے اسفل السافلین کے قعرِ مذلت میں جا گرا۔ جس کو خلیفۃ اللہ علی الارض بننے کے لیے خلق کیا گیا تھا، اور جسے شمس و قمر اور شجر و حجر کی تسخیر کا کام سپرد کیا گیا تھا وہ خود ہی بے طرح مسخر ہو گیا، جسے حکمت و رحمت کی بنا پر خوف و حزن سے بالاتر ہونا تھا وہ ہر چیز کے سائے سے کانپنے لگا، موہوم دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے اپنی قربانی کرنے لگا۔ جو جانوروں کا گوشت کھانے سے راضی نہ ہوتے تھے، ان کو اپنے چہیتے بیٹوں کا گوشت کھلانے لگا۔ جہالت سے شرک پیدا ہوا اور شرک سے مزید جہالت، اور جہالت و شرک نے مل کر اس کو ظالم بھی بنا دیا اور مظلوم بھی۔ اپنے اوپر ظلم کرنا دوسروں پر ظلم کرنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ شرک سے اس نے اپنے اوپر ظلمِ عظیم کیا اور اس ظلم نے اس کو کمال درجے کا ظالم بنا دیا۔ خلیفۃ فی الارض بننے کی صلاحیت والا انسان ظلوماً جھولاً ہو کر خذلان و خسران میں دستِ افسوس ملتا رہ گیا۔

انسان میں حکمت وہاں سے شروع ہوئی، جہاں اس نے حوادث کی کثرت کو قوانین کی وحدت میں منسلک کرنا شروع کیا۔ عقل کا کام یہی ہے کہ وہ علّت کو معلول کے ساتھ وابستہ کرے، اور حوادث کے باہمی روابط کا پتا چلائے۔ عقل کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ ہر جزو کو کسی کُل کے ساتھ وابستہ کرے، جزئیات سے کلیات تک پہنچے اور پھر کلیات سے جزئیات کو اخذ کرے۔ عقل کا یہ کام یا حکمت کا یہ سفر تب تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک کہ تمام جزئیات کلیات میں منسلک نہ ہو جائیں اور تمام کلیات ایک کل میں جا کر ختم نہ ہوں، جو کل جزئیات سے پہلے بھی ہے، جزئیات کے اندر بھی ہے اور جزئیات کے بعد بھی۔

حکمت کلی یا معرفت تام اس کا نام ہے کہ جو کل اول میں مصدر وجود قرار دیا جائے وہی منتہائے وجود بھی ہو۔ ہر ظاہر باطن کا اظہار ہو، اور ہر باطن ظاہر کا سرچشمۂ وجود۔ توحید کا دین بھی یہی ہے، اور سائنس اور حکمت بھی اسی کا نام ہے۔ عالم طبعی کی کوتاہ نظری اور خامی اتنی ہی ہے کہ وہ قوانین یا وحدتوں کی تلاش میں اپنے دائرۂ تحقیق کو مادی اور محسوس حوادث تک محدود کر لیتا ہے۔ ظاہر و باطن کے لحاظ سے کچھ کلیات آفاق سے حاصل ہوتے ہیں اور کچھ کلیات انفس سے۔ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ انفس و آفاق دونوں کے کلیات ازروئے مشاہدہ و عقل دریافت کرتے ہوئے ان سے آگے گزر کر ایسے کل کی طرف بڑھو جو انفس و آفاق یا ظاہر و باطن دونوں کی جزئیات اور کلیات کا ماخذ ہو دونوں پر حاوی اور دونوں میں جاری و ساری ہے۔ قرآن حکیم فطرت کے مشاہدے پر بہت زور دیتا ہے اور اس کو خداشناسی کا راستہ کہتا ہے لیکن فطرت خارجی بھی ہے اور باطنی بھی، وہ مادی اور جسمانی بھی ہے اور نفسی بھی۔ اس لیے یہ ارشاد ہے کہ فی انفسکم افلا تبصرون۔ جس سے یہ تعلیم اخذ کی گئی ہے کہ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ جس کو اپنے نفس کا عرفان حاصل ہوتا ہے، اس کو خدا کا بھی عرفان حاصل ہوتا ہے۔ توحید محض اس عقیدے کا نام نہیں ہے کہ خدا یا معبود ایک ہے اور متعدد نہیں۔ قرآن حکیم نے توحید کے اس بنیادی عقیدے کی ضروری تشریح بھی کی ہے اور اس ذات واحد کے صفات بتائے ہیں۔

صفات الٰہیہ

خدا کی سب سے اہم اور اساسی صفت رحمت ہے۔ رحمت کے مفہوم میں رحم بھی ہے اور محبت بھی، اور فیض بھی، قرآن کریم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوتا ہے اور سورۂ فاتحہ کا افتتاح بھی رحمت سے ہوتا ہے۔ انسان کے لیے ہر وجود یا مادی ہے یا ذہنی، یا زمان میں ہے یا مکان میں، یا زمان و مکان دونوں میں، اس کے علاوہ وجود کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ لہٰذا خدا کی نسبت اگر ھو الموجود کہیں یا لا موجود الا اللہ کہیں تو یہ موجودیت کا تصور ایمانی یا وجدانی ہی ہو سکتا ہے ادراکی نہیں ہو سکتا۔ صفات الٰہیہ کی بابت بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی ماہیت کیا ہے۔ خدا علیم ہے لیکن ہستی مطلق میں

علم کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے۔ اس کا تصور ممکن نہیں۔ انسان کا ہر علم جزوی ہوتا ہے۔ اس کے کلیات بھی دراصل جزئیات ہی ہیں۔ اور اسے زمان و مکان عالمِ کل ہستی کا علم کس انداز کا ہوگا، یہ ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ لیکن خدا کے صفات کو انسان آثار و امثال سے کسی قدر پہچان سکتا ہے جیسا کہ عارف رومی کہہ گئے ہیں ؎

ہیچ ماہیات اوصاف کمال کس نداند جز بآثار و مثال

اسلام کا اصل اور بنیادی کام خدا کی نسبت انسانوں کے عقائد کو درست کرنا تھا۔ اسلام نے توحید ہی کو اصل دین قرار دیا ہے اور اس کی تعلیم یہ ہے کہ یہ اصل اگر درست ہے تو نتیجے کے طور پر تمام علم اور تمام عمل درست ہو سکتا ہے لیکن اگر یہی اصل بگڑ جائے اور فاسد عقیدوں سے شرکِ جلی یا شرکِ خفی پیدا ہو جائے تو زندگی کے تمام فروع اس اصل کے بگاڑ سے بگڑ جائیں گے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ نبیوں کا کام خدا کی توحید کی توضیح و تلقین ہے۔ رسالت ہمیشہ سے اسی حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ رہی ہے۔ اسلام میں ختمِ نبوت کے عقیدے کی بنا بھی یہی ہے کہ آخری مرتبہ اس عقیدے کو خالص کر کے محفوظ کر دیا گیا۔ اس طرح سے رسالت کی جو غرض تھی وہ پوری ہو گئی اور نوعِ انسان پر اس حجت کا اتمام ہو گیا۔ ماننے نہ ماننے کا اختیار ہے۔ لیکن بات صاف کر دی گئی۔

اکثر مذاہب عقیدۂ توحید کے مدعی تھے لیکن کہیں بھی توحید کا تصور جہل کی آمیزش سے پاک نہ تھا۔ ایک خدا کے ساتھ لاتعداد دیوتا موجود تھے، زندگی کا اصلی کاروبار دیوتاؤں کی متلون مرضی پر موقوف تھا۔ ایک غیر مرئی خدا کے لیے کوئی حقیقی کام نہ تھا۔ عیسائیوں اور ہندوؤں میں ایک خدا کا تصور موجود تھا، لیکن یہ خدا کسی ایک انسان میں مجسم بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ ہر قوم میں اصلاحِ اخلاق اور صحیح عقیدۂ توحید کی تلقین کے لیے نبی بھیجے گئے، جو اعلیٰ درجے کے انسان ہی ہوتے تھے۔ وہ نہ قادرِ مطلق تھے اور نہ عالمِ کل۔ ان کو غیب کی اتنی ہی خبر رہتی تھی جتنی کہ خدا کی طرف سے ان کو مل جائے۔ لیکن ہندوؤں اور عیسائیوں نے اوتاروں کا تصور کر لیا کہ دنیا کی اصلاح کے لیے خدا کسی انسان کی صورت میں اُتر آتا ہے۔ بھگوت گیتا میں کرشن کی زبانی

یہی عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ جسے فیضی نے اس شعر میں ترجمہ کیا ہے ؎

چو بنیادِ دیں سُست گردد بسے برآریم خود را بشکل کسے

مشرق اور مغرب میں فلسفیانہ افکار ترقی کرتے ہوئے توحید تک پہنچ گئے تھے لیکن ویدانت اور جدید افلاطونیت میں خدا بالکل وراءالوراء اور نرگن یعنی صفات سے مطلقاً معرا ہو گیا تھا۔ ان دونوں فلسفوں میں خدا نہ صاحبِ ارادہ ہستی رہی اور نہ انسانوں یا دیگر مخلوقات سے اس کا کوئی خالقیت یا ربوبیت کا تعلق باقی رہا۔ یونانی فلسفہ سقراط افلاطون اور ارسطو تک پہنچ کر عقلی توحید کا ایک نظام فکر مرتب کر چکا تھا۔ انھوں نے عقلی منطق کو عقل کل قرار دیا اور خدا محض وحدتِ منطقی کا مرادف بن گیا۔ افلاطون نے کہا کہ عالم ازلی عالم مثل یا عالم تصوراتِ عقلیہ ہے۔ تصورات ہی اعیانِ ثابتہ ہیں، اور یہ اعیانِ ثابتہ ایک عین ثابت سے سرزد ہوتے ہیں۔ تمام تصورات کا ماخذ ایک تصور کلی ہے جس کو علم کہتے ہیں۔ وہ صرف کلیات ہی کا ہو سکتا ہے، جزئیات کا علم، علم نہیں کہلا سکتا۔ اس لیے کہ جزئیات کے وجود میں عدم کی آمیزش ہے۔ معدوم معلوم نہیں ہو سکتا، اس لیے خدا کو جزئیات کا کوئی علم نہیں۔ خدا کلیات ہی کا ایک ڈھانچہ ہے، اس کو افراد سے کوئی واسطہ نہیں خدا خود ہی عالم ہے اور خود ہی معلوم ہے۔ خدا کو اپنے سوا اور کسی چیز کا علم نہیں، اس لیے کہ خدا کے باہر ماسوا کا وجود ہی حقیقی نہیں۔ اس قسم کا خدا فلسفیوں کے کسی کام آ جائے تو آ جائے باقی انسان اس سے کسی قسم کا رابطہ قائم نہیں کر سکتے۔ نہ ایسے خدا سے زندگی کا کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اور نہ انسانی نفس کو اس سے کسی قسم کی تسکین حاصل ہو سکتی ہے۔ فلاطینوس کے فلسفہ اشراق میں خدا ایک مصدرِ نور بن گیا، جس سے کائنات بطریق تنزل سرزد ہوتی ہے۔ جو کچھ اس سے سرزد ہوتا ہے وہ بلا ارادہ سرزد ہوتا ہے۔ اور وہ مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھتا۔ یہ خدا ایسا نہیں ہے کہ اس کو پکارو تو وہ سُنے یا اس سے کوئی عبادت یا محبت کا رشتہ قائم ہو سکے۔ کچھ ایسا ہی حال ویدانیت کا بھی ہے۔ جس نے دیوتاؤں سمیت تمام کائنات کو مایا یا وجودِ باہمی قرار دیا۔ ویدانت کی یہ وراءالوراء ہستی بھی نہ خالق ہے، نہ

عالم، نہ رحمان، نہ رب۔ شنکر اچاریہ کے نزدیک یہ ذات نرگن یا صفات سے معرا ہے۔ ہر وجود اور ہر انفرادی نفس دھوکے کی پیداوار ہے۔ زندگی کا مقصد اس کو باطل سمجھ کر اس سے گریز کرنا ہے۔ نفوس و موجودات کے بطلان کی معرفت اصل گیان ہے جس کے حصول کے بعد نہ نفس باقی رہے گا اور نہ کائنات۔ اس نفس کلی سے ذاتِ مطلق کا اثبات ہو جائے گا۔ فلسفوں کے علاوہ ادیان کا یہ حال تھا کہ بدھ مت میں خدا بالکل غائب ہو گیا، کائنات اور نفوس بے حقیقت ہو گئے۔ ہر قسم کی آرزو ایک دھوکا ہے۔ آرزوؤں کے دھوکے حیات آفرینی کرتے ہیں۔ اور یہ آرزوئیں عارضی طور پر مجسم ہو جاتی ہیں۔ انسان کے لیے فقط ایک ہی آرزو حقیقی ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس کی کوئی آرزو نہ رہے۔ آرزوؤں کے نابود ہونے سے زندگی میں آواگون کا چکر ختم ہو جائے گا اور وہ حالت پیدا ہو جائے گی جسے نروان کہتے ہیں۔ جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ نفیِ مطلق کے بعد جو اثباتِ مطلق حاصل ہوتا ہے تصور کے لیے وہ خود بھی ایک سلبی کیفیت ہے، جس کے متعلق کوئی ایجابی تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا نصب العین زندگی کو الم آفریں دھوکہ سمجھ کر اس سے گریز کرنا ہے۔ گویا احسن لائحہ عمل یہ ہے کہ زندگی سے ذہنی اور عملی گریز کے طریقے سیکھے جائیں۔ ترکِ دنیا، ترکِ عقبیٰ، ترکِ مولا، ترکِ ترک۔ بدھ مت کا نظریۂ حیات اس مصرعہ سے بہتر چند الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتا۔ باطل سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں حق سے بھی نجات حاصل ہو گئی ؎

رندے دیدم نشستہ بر روئے زمیں نہ کفر، نہ اسلام، نہ دنیا و نہ دیں
نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں در ہر دو جہاں کرا بود زہرہ ایں

کائنات بھی معدوم، دیوتا بھی مفقود، آرزوؤں کا صفایا، نصب العین حیات اور ہر چیز سے بے تعلقی، ہر شے سے نجات، نہ کوئی مقصود، نہ معبود، نہ تلاشِ بہبود۔ رہبانیت ترقی کرتے ہوئے کامل نفیِ حیات تک پہنچ گئی۔

نصرانیوں نے مسیح علیہ السلام کی تعلیم کو عجیب طریقے سے مسخ کیا۔ وہ مسیح جو

اپنے لیے نیک کا لفظ بھی استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا (جب اس کو کسی نے اچھا کہا تو اس نے جواب دیا کہ اچھا تو میرا آسمانی باپ ہے) اس برگزیدہ بندۂ خدا کو غلط اندیش پرستاروں نے خدا کا شریک بلکہ عین خدا بنا دیا۔ توحید کی تعلیم دینے والا، تثلیث کا شکار ہو گیا، اور اقانیم ثلاثہ میں سے ایک اقنوم بن گیا۔ پہلے اس کو خدا کا بیٹا بنایا پھر بیٹے اور باپ کو ہم ذات بنایا، پھر اس خدا کو تمام جہان کا کفارہ بننے کے لیے مصلوب ہو کر بہت بری موت مرنا پڑا۔ خدائے رحیم اپنی رحمت اور ربوبیت کا اظہار اس سے بہتر طریقے سے نہ کر سکا۔ دیوتاؤں کو انسانی قربانی سے خوش کرنے کا عقیدہ ہزارہا برس سے توہم پرست انسانوں میں راسخ ہو چکا تھا۔ عیسائیت میں توحید اسی دورِ وحشت کی طرف عود کر گئی۔ مسیح رحمت بن کر آیا تھا لیکن اس کے پیرووں نے اس کو ایک غیر عادل، اور ظالم خدا کا نمائندہ بنا دیا۔ خدا کے رحیم ہونے کا دعویٰ اس کے اعمال سے باطل کر دیا گیا۔ آدم کا گناہ موروثی ہو گیا۔ جو انسان پیدا ہو گا، وہ ناکردہ گناہ کا مجرم پیدا ہو گا۔ خدا کو بدنام کرنے کے بعد عیسائیت نے انسان کو ذلیل کیا، یہ جرم کسی نیکی سے نہیں دھل سکتا۔ حسن عمل نجات کے لیے کارگر نسخہ نہیں۔ خدا نے ایک طرف معصوم مسیح کو بھینٹ چڑھایا اور دوسری طرف یہ حکم دے دیا کہ کسی کے نیک اعمال کام نہیں آسکتے، جب تک کہ کوئی شخص اس پر ایمان نہ لائے کہ مسیح کی صلیبی موت اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گئی ہے۔ یہ ایمان پیدا کر لینے کے بعد بے عمل کو بھی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

ادیان اور فلسفوں کے اس مختصر بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ توحید کے عقیدے کے بغیر یا توحید کے عقیدے کو مسخ کرنے سے کس طرح زندگی کے متعلق تمام تصورات مسخ ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اسلام نے توحید کو اصل دین قرار دیا ہے۔ اگر یہ عقیدہ درست ہو جائے تو عبادات بھی درست ہو جاتے ہیں اور معاملات بھی۔ جس کا رابطہ خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے، اس کے نظریات اور اخلاقیات خود بخود بطور نتیجہ صراطِ مستقیم پر آجاتے ہیں۔ اسلام نے توحید کو اس قدر خالص کر دیا کہ اس سے

زیادہ خالص کرنا ممکن نہیں۔

توحید ہی سے سرزد ہونے والا اسلام کا بنیادی عقیدہ جس سے باقی تمام عقائد اور اعمال صالحہ بطور نتیجہ حاصل ہوتے ہیں، یہی ہے کہ یہ کائنات مہمل اور بے مقصود نہیں ہے۔ یہ کائنات مایا نہیں، باطل نہیں تماشا نہیں۔ خدا کی قوتوں اور نعمتوں کے خزانے لامحدود ہیں، لیکن وہ ہر شے کو ایک معیّن انداز سے خلق کرتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز میں ایک صنعت ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک صانع ہے۔ اس میں حسن و جمال ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصل ہستی خلّاق و جمیل اور جمال پسند ہے۔ اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی آئین کے ماتحت ہوتا ہے، کوئی واقعہ اتفاقی یا بے علت ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اسلامی عقیدے کے مطابق کوئی ہستی بے جان نہیں، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ زبان حال سے صانع کا تسبیح خواں ہے خواہ ہم اس تسبیح کو نہ سمجھ سکیں ؎

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند ۔۔۔ با من و تو مردہ با حق زندہ اند

طبقاتِ وجود میں ہر طبقہ اپنا مخصوص آئین اور مخصوص نظام رکھتا ہے۔ آئین و نظم عقل کے مظاہر ہیں، اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ مادی اجسام میں بھی ایک قسم کی عقل ہے، جسے ہم اپنے مقابلے میں لاشعوری عقل کہہ سکتے ہیں۔ اجرام فلکیہ اپنے مداروں میں نہایت حساب سے گردش کرتے ہیں کلٌّ فی فلکٍ یسبحون کسی کی مجال نہیں کہ وہ بے حساب آگے پیچھے ہو جائے۔

اسلام سے قبل عقلیت اور روحانیت دونوں غلط راستوں پر پڑ گئی تھیں معقولات اپنی تجرید میں موجودات سے بے تعلق ہو گئے تھے، اور افلاطون کی طرح یہ نظریہ قائم کر دیا گیا تھا کہ معقولات لطیف ہیں اور موجودات کثیف لہٰذا کثیف کو چھوڑ کر لطیف کی طرف صعود کرنا چاہیے۔ اسی نظریہ کے ماتحت جسم کو روح کا زنداں قرار دیا گیا۔ جسم کو گھلانا روح کی پرورش کرنے کے لیے لازمی ہو گیا۔ عقلیت اور روحانیت دونوں کا رخ رہبانیت کی طرف ہو گیا۔ ادیان اور فلسفوں نے زندگی کے خلاف

بغاوت کردی۔ مادہ اور مادی کائنات، جسم اور جسمانی زندگی سب مردود اور ملعون ہو گئے۔ خالق کا مخلوق سے رشتہ منقطع ہو گیا، حکمت اور روحانیت یہی رہ گئی کہ فرار اور گریز کی راہیں تلاش کی جائیں۔ بدھ مت اور عیسائیت دونوں نے دنیاوی زندگی کو ملعون قرار دیا۔ نسل انسانی کی بقا اور افزائش گنہگاری کا فعل بن گیا۔ روحانی شخص اس کو کہنے لگے جو کوئی کام کاج نہ کرے۔ بھکشو بلند درجے کا انسان بن گیا، سادھو انسان کامل ہو گیا، راہب کے لیے شادی کرنا ناجائز ہو گیا۔ ایک مرتبہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو راہب سے ملاقات ہوئی، جو بیوی بچوں کو چھوڑ کر ہمالہ کے پہاڑ میں چلا گیا تھا۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ کالج میں فلسفہ پڑھتا تھا۔ میں نے یہ ارادہ کیا کہ تھوڑی سی بحث کر کے اس کی رہبانیت کو ایک لغو فعل ثابت کروں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ حضرت جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے اگر سب یہی اختیار کریں تو دنیا ہی ختم ہو جائے۔ اس نے جواب دیا کہ ہم تو یہی چاہتے ہیں، اس سے بہتر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا جو سراسر دھوکا ہے ناپید ہو جائے۔

دیگر مذاہب والے بعض اوقات پوچھتے ہیں کہ اسلام دنیا میں کیا نیا تصور لایا۔ اس کا جواب سادہ اور سہل ہے۔ اسلام نے کائنات کو حق اور زندگی کو نعمت قرار دیا۔ کچھ نعمتیں خدا کی ربوبیت مہیا کر دیتی ہے، اور کچھ اور نعمتوں کو سعی و عمل کا نتیجہ شمار کرتی ہے۔ زندگی میں جو رکاوٹیں نظر آتی ہیں۔ وہ انسان کو مشق ارتقا کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ زندگی کا مقصد عرفان اور سیرت سازی ہے۔ کوئی مشکل یا مصیبت شر محض نہیں۔ خدا خیر مطلق ہے۔ اس لیے وہ شر مطلق کا آفریدگار نہیں ہو سکتا۔ مشیت کا اصول یہ ہے کہ خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد۔ نظر عارف اور عمل صالح ایک اکسیر ہے جو ادنیٰ کو اعلیٰ اور شر کو خیر میں تبدیل کر سکتی ہے۔ موت اور حیات ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں۔ ان میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں۔ اگر کوئی شخص زندگی کے آئین سے آشنا ہو جائے تو وہ ہر زحمت کو رحمت میں تبدیل

کرسکتا ہے، اور موت کو زندگی میں بدل سکتا ہے۔ آئینِ ہستی یہی ہے کہ ہر قدم پر فنا سے بقا حاصل ہوتی ہے۔ رہبانی مذاہب اور فلسفوں کو زندگی سراسر زحمت دکھائی دی اور وہ پکار اُٹھے کہ ؎

یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

بعض نے کہا نہیں یہ ایسی لعنت ہے کہ سر جائے اور جان جائے تو بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہ ہو، جب تک کہ اس سے چھٹکارے کا کوئی خاص نسخہ ہاتھ نہ آئے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ۔۔۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

کسی نے کہا کہ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں ۔۔۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

قرآن کریم اس کی تصدیق کرتا ہے کہ اگر ایمان یا صحیح زاویۂ نگاہ اور صبر کی صفت نہ ہو تو زندگی گھاٹے ہی کا سودا معلوم ہوگی۔ والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

فطرتِ خارجی کا بنانے اور چلانے والا خود خدا ہے۔ وہ اس میں نظم و آئین بھی پیدا کرتا ہے اور حسن و جمال بھی۔ وہ براہ راست اس کی بقا اور ارتقا کا ضامن ہے۔ لیکن انسان جس کو اس دنیا میں خدا کا نائب بنانے کے لیے بھیجا گیا ہے، اس کے متعلق ایک دوسرا آئین ہے۔ جس ہستی کو قدرتِ مطلقہ سے سب سے زیادہ بہرہ اندوز بنانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس کو شروع میں سب سے زیادہ بے بس بنایا جاتا ہے۔ تمام حشرات الارض پیدا ہوتے ہی اپنی زندگی کے خود کفیل ہو جاتے ہیں۔ انسان کے بچے کی مدت دراز تک یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر بروقت اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو وہ زندہ نہ رہ سکے۔ انسان کو مسخرِ کائنات اور قادر علی الفطرت بنانا مقصود ہے اس لیے اس کا وظیفۂ حیات یہ ہے کہ وہ خود اپنی تقدیر کا معمار بنے۔ اس سے کم تر مخلوق کی تقدیر کلیتاً خدائے قادر کی ساختہ پرداختہ ہے۔ انسان کو عقل اور اختیار اور غیر معمولی صلاحیتیں عطا کر کے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ان کے صحیح استعمال سے ہر مسِ خام کو

کمنداج بنا تا جائے۔ اگر اس کی نگاہ نہ ہوئی اور اس کا عمل صحیح نہ ہوا تو وہ کالانعام بل هم اضل درجۂ حیات میں جانوروں سے بھی پست تر ہو جائے گا، اور اگر ایمان اور عمل صالح کی اکسیر حیات سے کام لے گا تو خدا کی نیابت میں کائنات کا حکمران اور مسجودِ ملائک ہو جائے گا۔ انسان کے لیے زندگی خوانِ نعمت بھی ہے اور میدانِ جہاد بھی۔ اگر اس نے جدوجہد سے گریز کیا اور زندگی کی رکاوٹوں کو دیکھ کر آنسو بہانے لگا تو کوئی نعمت بھی اس کے لیے نعمت نہ ہو گی۔ غلط روحانیت یا رہبانیت جدوجہد سے گریز کرنے سے پیدا ہوئی، لیکن مشکلات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے سے مشکلات رفع نہیں ہو جاتیں بلکہ اور بدتر صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

رہبانیت حقیقت میں یاس اور قنوط کی پیداوار ہے۔ کمزور انسان جذبات کی کشاکش اور زندگی کی پیکار کو دیکھ کر ہر قسم کی اصلاح سے مایوس ہو گیا۔ اس نے زندگی سے گریز کر کے سیدھا خدا کی طرف بڑھنا چاہا، لیکن قرآن حکیم کہتا ہے کہ وہ قربِ الٰہی اور رجعت الی اللہ کا حق ادا نہ کر سکا کیونکہ اس کا زاویۂ نگاہ زندگی اور خدا دونوں کے متعلق غلط تھا۔ اس کا مقصود غلط نہ تھا لیکن حصول کا راستہ غلط تھا جس کو اس نے صراطِ مستقیم سمجھا وہ ایک پُر پیچ بھول بھلیاں تھا۔ گمراہی سے اس کا راستہ اور طویل ہو گیا۔ بس کہ دراز او فتد جادۂ زگمراہیم۔

یہ صحیح ہے کہ کوئی مذہب بھی جس میں قنوط ہی قنوط ہو، فطرتِ انسانی کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا اس لیے رہبانی مذاہب نے اکثر یہ کیا کہ اس دنیا اور اس زندگی سے تمام امیدیں منقطع کر کے ان کو حیات بعد الموت یا کسی کیفیت ماوراء حیات کے ساتھ وابستہ کر دیں، جس سے ایک طرح کی آخرت پرستی پیدا ہو گئی۔ اسلام موجودہ زندگی سے اگلی زندگی کا منکر نہیں ہے لیکن اعلیٰ درجات، ادنیٰ درجاتِ حیات کا حق ادا کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اسلام ترکِ دنیا کا نام نہیں، بلکہ دنیا کو دین بنانے کا نام ہے۔ اسلام نے عبادت کا مفہوم بدل دیا۔ دیگر مذاہب میں عبادت ایک مخصوص عمل بن کر رہ گیا تھا، جسے پوجا پاٹ کہتے ہیں مورتاؤں یا خدا کے سامنے کچھ بھینٹ یا نذر نیاز پیش کرنا، یا ان

کو خوش کرنے کے لیے معینہ منتر یا دعائیں پڑھنا۔ اسلام نے عبادت کے مفہوم کو وسیع کر کے تمام حیاتِ طیبہ کا ہم معنی بنا دیا۔ دین کا مفہوم واضح اور معین کرنے کے ساتھ ہی خود بخود عبادت کا مفہوم بھی معین ہو گیا۔ اسلام میں دین اور فطرت اللہ ہم معنی ہیں۔ تمام موجودات خدا کی فطرت اور اس کی سنت کی آئینہ دار ہے۔ ازلی اور ابدی ہونے کے لحاظ سے اس کے آئین میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس فطرت میں تلون نہیں ہے۔ فطرت اللہ کا سب سے بڑا مظہر انسان ہے۔ فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا ذالک الدین القیم کسی مذہب یا فلسفے میں دین کی اس سے بہتر تعریف نہیں مل سکتی۔ کوئی کہتا ہے کہ دین ان عقائد کا نام ہے جن کا کوئی ثبوت مشاہدے یا عقل سے نہیں مل سکتا کوئی کہتا ہے کہ دین فطرت سے گریز کرنے کا نام ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ دین عین فطرت ہے۔ اس لحاظ سے کائنات میں کوئی چیز بھی بے دین نہیں ہے۔ شجر و حجر کا بھی دین ہے۔ اور شمس و قمر کا بھی دین ہے۔ تمام کائنات دین پر قائم ہے۔ ستاروں کا اپنے مداروں میں حساب سے چلنا ستاروں کا دین ہے۔ اور یہ حکم برداری ان کی عبادت ہے ؎

گر چرخِ فلک گردی سر بر خطِ فرماں نہ
ور گوشہ زمیں باشی وقفِ خمِ چوگاں شو

دیگر مذاہب میں یہ ہوا کہ عبادت کا مفہوم تنگ کر دینے کی وجہ سے فقط خاص قسم کے اعمال کو عبادت سمجھ لیا گیا۔ خاص خاص ایام اور اوقات اور خاص خاص طریقے ان کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ کچھ لوگ ان طریقوں کے ماہر قرار دیے گئے۔ وہ پیشہ ور مذہبی گروہ بن گئے۔ ان پیشہ ور پیشواؤں کی مدد کے بغیر عام لوگ مخصوص عبادات بھی ادا کرنے کے مجاز نہ رہے۔ برہمنوں کے اور وید کوئی نہ پڑھ سکتا تھا۔ نیچی ذات والوں کے لیے مذہب میں یا دخل اندازی اور یہ اجارہ شکنی جرمِ عظیم بن گیا، جس کے لیے بڑی بھیانک عذاب ناک سزائیں تجویز کی گئیں۔

عبادت ایک مخصوص تکنیک بن گئی، جو ہر شخص کے بس کی بات نہ رہی۔ البتہ وہ پروہتوں کو یہ خطرہ ہوا کہ اگر آزادانہ طور پر دین کو سمجھے اور اس پر عمل کرنے لگے تو مذہبی

پیشواؤں کا تفوق زائل ہو جائے گا۔ اسلام نے معبود کو بلا واسطہ عابد کے قریب کر دیا۔
عابد و معبود کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہی۔ اسی طرح اسلام پہلا دین ہے جس نے
عباداتِ مخصوصہ کے لیے بھی کسی معبد یا عبادت گاہ کو لازم قرار نہیں دیا۔ رسول کریمؐ
نے فرمایا کہ ہمارے دین کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ تمام دنیا ہمارے لیے
مسجد بنا دی گئی ہے۔ دنیا کا چپہ چپہ سجدہ گاہ ہے، ہر قطعۂ زمین جس پر سجدہ کیا جاتا ہے
وہاں کا فرش عرشِ الٰہی سے ملحق ہو جاتا ہے۔ جب خدا انسان کی شہ رگ سے بھی قریب تر
ہو گیا تو پیشہ ور مذہبی ایجنٹوں کی ضرورت نہ رہی، جن کی مدد سے ہم خدا کا قرب حاصل
کریں۔ اسلام میں نہ معبد کی ضرورت رہی اور نہ پیشہ ور عابد کی۔ اس کے علاوہ تمام اعمالِ
صالحہ عبادت میں داخل ہو گئے۔ محنت سے روزگار پیدا کرنا بھی عبادت قرار دیا گیا۔
الکاسب حبیب اللہ۔ دنیا کے تمام کاموں اور تمام حرفوں اور پیشوں میں وقار پیدا ہو گیا۔
کوئی کام فی نفسہ نہ ادنیٰ رہا، نہ اعلیٰ۔ جو کام اصولِ خیر، حصولِ خیر اور آئینِ فطرت کے
ماتحت کیا جائے، وہ اچھا کام ہے اور عبادت ہے اور بڑے سے بڑا کام اگر آئینِ
الٰہی کو نظر انداز کر کے یا اس کی خلاف ورزی کر کے کیا جائے تو وہ مردود فعل ہے۔

اسلام کا بنیادی نظریہ بھی یہ تھا کہ دین اور دنیا الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ دنیا کو صحیح
نظر سے دیکھنا اور اس میں حسنات کا پیدا کرنا بھی دین ہے۔ ربنا اتنا فی الدنیا حسنة
وفی الاخرة حسنة۔ اسلام نے یہ گر بتایا کہ کس طرح تمام زندگی پر روحانیت کا رنگ یا
صبغۃ اللہ چڑھ سکتا ہے۔ تمام طیبات انسان کے لیے حلال ہو گئے۔ علم و حکمت کے تمام
دروازے کھل گئے، کوشش کرنے والوں کو یہ خبر دی گئی کہ صلاح و فلاح میں مساعی کو
صحیح راستے بتائے جائیں گے۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا۔ حکمت
کے طالب کو حکمت عطا ہو گی، جو خیرِ کثیر ہے، جس سے انسان کو حقیقت کا عرفان اور حیاتِ
طیبہ حاصل ہو گی۔ اسلام نے مومن کے لیے ارتقا کے تمام راستے کھول دیئے اور اس
کا اعلان کر دیا کہ دین انسانوں کے لیے تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ اسلام میں نہ عبادات
میں تنگی ہے اور نہ معاملات میں، خدا انسان سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتا جو اس کی

قدرت اور ہمت سے بالاتر ہو، اسلام میں ہر علم اور ہر ہدایت کے ساتھ تخفیف اور سہولت کے پہلو موجود ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ دو طریقوں میں سے وہ طریقہ اختیار کرو جس میں سہولت ہو بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اسلام نے جس دنیا کو مذموم قرار دیا وہ بے دین دنیا ہے جو خدا کی طرف سے غافل ہونے سے پیدا ہوتی ہے ؎

چیست دنیا از خدا غافل شدن   نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

حقوق العباد کی ادائیگی حقوق اللہ سے کوئی الگ تھلگ چیز نہیں۔ یہ تفریق محض اضافی ہے جو شخص بندوں کا حق ادا کرتا ہے، وہ خدا کا حق ادا کرتا ہے ؎

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست   بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

صلح و جنگ

اسلام کو اس کے دشمنوں نے اور ناداں دوستوں نے شمشیر زنی کا مذہب قرار دیا، یہ ایک بہتانِ عظیم ہے ایسے دین کے متعلق جس کی ماہیت اور جس کا مقصد ہی سلامتی سلامت روی اور امن کوشی ہے۔ اسلام کے سوا تاریخ ادیان میں کسی دین کے لیے کوئی معنوی اسم نہیں ہے انسانوں نے ادیان کو انبیا اور پیشوایان دین کے ناموں کے ساتھ منسوب کر رکھا ہے، کوئی دین بدھ مت کہلاتا ہے، کوئی عیسائیت، کوئی زرتشت کے نام کے ساتھ منسوب ہے، کوئی موسیٰ کے ساتھ۔ اسلام نے یہ اعلان کیا کہ رسولوں اور مبلغوں کے ناموں سے دین الٰہی کا منسوب کرنا ناجائز ہے۔ رسولوں کی رسالت ذریعہ حصول مقصد ہے، بذاتہ مقصود نہیں۔ دین ازلی اور ابدی حقیقت ہے، اور یہ سرمدی حقیقت امن جوئی ہے۔ انسان جب راہ راست سے بھٹک جاتا ہے تو سب سے پہلے اس کے نفس میں ہی خانہ جنگی شروع ہوتی ہے۔ ایک خواہش دوسری خواہش سے ایک جبلت دوسری جبلت سے برسرپیکار رہتی ہے انسان کی اندرونی نفسی مملکت میں عدل کی جگہ ظلم اور امن کی جگہ فساد رونما ہے۔ انسان دوسروں پر ظلم کرنے سے پہلے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور پھر یہی داخلی ظلم خارجی ظلم کی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے، اور انسان اپنے ماحول سے مخالفت شروع کرتا ہے؛ جو شخص اپنے پر ظلم کرتا ہے وہ دوسروں

کے ساتھ عدل کیسے کر سکتا ہے ع

تو بخویشتن چہ کردی کہ باکنی نظیری

ایسا شخص ہر جگہ، ہر حالت میں پھر انسان کے ساتھ فساد کا باعث ہوتا ہے۔ اسلام کا مقصد واحد یہی ہے کہ نفسی و آفاقی اور داخلی و خارجی فتنہ و فساد کو رد کیا جائے۔ قرآن کریم نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال کر دیکھا کہ انسانی زندگی میں فتنہ و فساد کس کس راستے سے داخل ہوتا ہے، اور پھر ان تمام راستوں کو مسدود کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ ہر قوم نے اپنے اپنے دیوتا اور معبود تراش رکھے تھے، ایک ہی قوم کے مختلف دیوتا بھی آپس میں ہم آہنگ نہیں تھے، مثلاً ہر فطرت میں ہر مظہر کا ایک رب النوع تھا، اور آپس میں وحدت عمل کے لیے ان میں کوئی سمجھوتہ نہیں تھا۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کہ کائنات ایک منظم حقیقت ہے۔ اس کے تمام آئین کسی مرکزی آئین سے سرزد ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ موجودات میں اگر کئی خالق اور ناظم ہوتے تو اس میں فساد بپا رہتا۔ اگر کائنات میں کثرت حوادث کسی وحدت میں منسلک نہ ہوتی تو کسی چیز کا قائم رہنا تو درکنار، شروع سے کوئی چیز وجود میں ہی نہ آسکتی۔

اسلام دین وحدت ہے۔ وحدت کا دوسرا نام ہم آہنگی اور صلح بین الاضداد ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے انسان کے نظریۂ حیات میں فساد کو رفع کر کے امن پیدا کیا۔ جن قلوب پر شرک کی حکومت ہو، ان میں حکمت بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ حکمت متضاد نما چیزوں میں غیر مرئی اور عقلی وحدت کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ از روئے حکمت شرک تمام جہالتوں کا منبع ہے، اور جہالت سے ظلم اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ توحید کی تعلیم حکمت کی تعلیم ہے، اور حکمت جہالت اور ظلم کو دور کرتی ہے۔ جس دین نے توحید کو اصل دین قرار دیا، اس نے اپنا نام اسلام رکھا۔ جس نفس میں جس قدر توحید کی معرفت ہوگی اسی قدر اس کے اندر سلامتی ہوگی اور عالم انفس و آفاق کے ساتھ ہم آہنگی پیدا ہوتی جائے گی۔ ایمان کے لفظ کا مادہ بھی امن ہے۔ سچا ایمان اسی کو کہہ سکتے ہیں جو مومن کی طبیعت میں امن پیدا کرے اور انسانوں کے بارے میں اس کو امن پسند بنا دے۔

اسلام جنگ کو نہ مقصودِ حیات سمجھتا ہے۔ اور نہ کوئی خوشی گوار فعل۔ جہاں تک ہو سکے وہ اس سے بچنے کی تلقین کرتا ہے۔ کسی بے گناہ کو قتل کرنا جرم عظیم ہے۔ احترام حیات کی تعلیم دیتے ہوئے قرآن نے چند الفاظ میں ایسا حکیمانہ نکتہ بیان کیا ہے جو اس بارے میں اس کے تمام نظریۂ حیات کی وضاحت کرتا ہے۔ من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا۔ جو کوئی کسی شخص کو قتل کرے بغیر اس کے کہ اس شخص نے کسی کی جان لی ہو، یا دنیا میں فتنہ و فساد پھیلایا ہو، تو اس نے اپنے اس فعل سے گویا تمام نوع انسان یا تمام انسانیت کا خون کر دیا۔ کسی مذہب، تہذیب یا تمدن کو جانچنے کا ایک معیار ہے کہ اس کی تعلیم اور اس کے عمل میں کہاں تک احترام حیات پایا جاتا ہے۔ اسلام نے جو جنگ کی اجازت دی ہے وہ فتنہ و فساد کو روکنے کی غرض سے ہے۔ جب قتل کرنے کے بغیر فتنہ رفع نہ ہو سکتا ہو تو اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ الفتنۃ اشد من القتل۔ قتل بری چیز ہے۔ لیکن فتنہ اس سے کہیں زیادہ قبیح ہے۔ اس لیے جہاں قتل یا جنگ کے بغیر فتنہ فرو نہ ہو سکتا ہو، وہاں نہ صرف جنگ کی اجازت ہے۔ بلکہ جنگ کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ چونکہ صرف رفع فتنہ کے لیے جنگ کی اجازت دی گئی ہے، یہ تاکید کی گئی قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین للہ۔ رسول کریمؐ کو جنگ اس لیے کرنی پڑی کہ کفار آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ تبلیغ کی اجازت نہ دیتے تھے، اور مومنوں کو محض اس لیے اذیت پہنچاتے تھے کہ ان کے عقائد مشرکوں کے عقائد کے مخالف ہیں۔ اسی مخالفت میں انھوں نے بڑا فتنہ بپا کر رکھا تھا مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ یعنی دین کی تبلیغ اور اس پر عمل کرنے کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ ہٹ جائیں۔ جنگ کی سزا فقط ظالموں کے لیے ہے۔ اگر وہ ظلم سے باز آ جائیں تو ان کے خلاف تلوار نہ اٹھائی جاسکے۔ فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظالمین۔ جنگ کی اجازت صرف ان لوگوں کے خلاف ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی کر کے فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔ ایسے لوگ مذہب ایم

کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ انما السبیل علی الذین یظلمون الناس ویبغون فی الارض بغیر الحق۔ اولئک لھم عذاب الیم۔ ایسے لوگ جنھوں نے اسلام تو قبول نہیں کیا، لیکن مسلمانوں سے دین کے معاملے میں جنگ بھی نہیں کی، اور نہ ان کو گھروں سے نکالا ہے، ایسے امن پسند غیر مسلموں کے ساتھ تم کو احسان اور انصاف کرنے سے خدا نہیں روکتا۔ خدا احسان اور انصاف سے محبت کرتا ہے اور اس کا دائرہ، غیر مسلم امن پسندوں تک وسیع کرتا ہے لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم، ان اللہ یحب المقسطین۔ انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم و من یتولھم فاولئک ھم الظلمون (الممتحنۃ)۔

اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہے لا اکراہ فی الدین۔ رسول کریمؐ کی زندگی یا صحابہ کرام کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اسلام جب اپنی پوری قوت پر تھا اور قیصر و کسریٰ کا تخت الٹ چکا تھا، اس وقت بھی حضرت عمر فاروقؓ جیسے مقتدر خلیفہ اپنے مسلم غلام تک کو جبر سے مسلمان بنانے کے قائل نہ تھے۔ جب اس غلام نے نہ مانا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمھیں اختیار ہے، دین میں جبر نہیں ہو سکتا۔ لا اکراہ فی الدین۔ جن دشمنانِ حق نے رسول کریمؐ پر تہمت لگائی ہے کہ وہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لیے پھرتے تھے، ان کی تردید کے لیے رسول کریمؐ کی زندگی کے کئی واقعات پیش کیے جا سکتے ہیں، جن سے مذہب کے معاملے میں ان کی کمال رواداری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یثرب میں ایک رسم تھی کہ جن عورتوں کے بچے زندہ نہ رہتے تھے وہ منت مانتی تھیں کہ اگر میرا بچہ زندہ رہا تو میں اس کو یہودی بناؤں گی۔ اس طرح کے بہت سے بچے بنی نضیر کے گھروں میں یہودی مذہب کے پیرو تھے۔ جب اسلام کو قوت حاصل ہو گئی تو ان بچوں کے

مسلمان باپوں نے رسول کریمؐ سے عرض کیا کہ ہم اسلام کو یہودیت سے بہتر دین سمجھتے ہیں، اب ہم ان بچوں کو مسلمان بنائیں گے، اور یہودی نہ رہنے دیں گے۔ بہت سے محدثین اور مفسرین اس پر متفق ہیں کہ لا اکراہ فی الدین کی شان نزول یہی ہے کہ خدا نے اجازت نہ دی کہ ان بچوں کو بجبر مسلمان بنایا جائے۔ قرآن کریم میں اور بھی کئی جگہ مذہبی آزادی کو اسلام کا رویہ قرار دیا گیا ہے۔ ومن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر، جس کا جی چاہے مومن بن جائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے۔ خدا چاہتا ہے کہ لوگ مومن بن جائیں اور اس کو یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ تمام نوع انسان کو بجبر مومن بنا دے لیکن خدا اپنی خواہش اور قدرتِ کاملہ کے باوجود دین کے معاملہ میں جبر نہیں کرنا چاہتا ایمان کی اصل ہی یہی ہے کہ اس کو آزادی کے ساتھ افضل سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ جبر سے ایمان کی ماہیت ہی زائل ہو جاتی ہے۔ جبر سے جو کچھ حاصل ہوگا وہ ایمان نہیں کہلا سکتا۔ ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین۔ اگر تیرا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ ایمان لے آتے، کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ مومن ہو جائیں۔ خدا یہ بھی نہیں چاہتا کہ کسی خارق عادت نشانی سے لوگوں کو مرعوب اور عاجز کرکے ان میں ایمان پیدا کرے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا جبر ہے۔ کسی معجزے سے وہ کیفیت تو پیدا نہیں ہو سکتی جسے ایمان کہتے ہیں۔ ایمان فقط آزادانہ حقیقت شناسی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا نبی کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ شاید تو اس رنج میں گھل گھل کر جان دے دیگا کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ایک ایسی نشانی اتار دیں کہ اس کے آگے ان کی گردنیں جھک جائیں۔ مگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ زبردستی کسی کی گردن جھکانا ایمان آفرینی کا طریقہ نہیں ہے۔ خدا کو ایسے ایمان کی ضرورت نہیں ہے جو معرفت سے پیدا نہ ہوا ہو اور جس کو انسان نے خوشی سے اختیار نہ کیا ہو۔

جبر و اختیار

اسی تعلیم سے جبر و اختیار کے مسئلے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ مسئلہ مسلموں اور غیر مسلموں

اور حکمائے شرق و غرب میں ہمیشہ سے ایک معرکتہ الآرا مسئلہ رہا ہے، قرآن میں تصویر کے دونوں رخ ملتے ہیں۔ آیات کو اگر الگ الگ کر کے پڑھا جائے تو بعض میں سے جبر نکلتا ہے اور بعض میں سے اختیار۔ خدا خالق کل اور قادر مطلق ہے اس نے تمام مخلوقات کو خلق کیا اور ہر شے کی خلقت کے قوانین بھی بنائے، جو کچھ وجود میں آیا، اس کی مرضی سے وجود میں آیا، اس کی مرضی کے بغیر کوئی پتا نہیں ہل سکتا۔ ہر عامل کو عمل کی قوت بھی خدا ہی نے عطا کی ہے۔ دنیا میں اور انسانی زندگی میں بے شمار علتیں کام کرتی ہیں اور ہر علت لازماً اپنا معلول پیدا کرتی ہے لیکن تمام علتیں آخر میں ایک علت العلل پر ختم ہوتی ہیں اور یہ علت العلل خود خدا ہے۔ لہٰذا جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی کڑیاں آخر میں علت العلل پر منتہی ہوتی ہیں۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات اور انسان کی عنان حکومت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس نے انسان کو خاص دائرہ عمل میں اختیار دے رکھا ہے۔ اس کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھا دیے ہیں۔ اخلاقی قانون کچھ قدرت اور نفس انسانی کی لوح پر مرقوم ہے، انسان کو اختیار ہے کہ وہ ان دو راستوں میں سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ نیکی اور بدی اور اجر و تعزیر کے آئین مقرر ہیں۔ اعمال انسانی بھی میزان میں اسی اتقان اور باریکی کے ساتھ تلتے رہتے ہیں جو اتقان کہ اجرام فلکیہ کی حرکت اور دیگر طبعی حوادث میں پایا جاتا ہے۔ تقدیر کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ خیر و شر کے قوانین معین ہیں، ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ انسان کو جن حدود کے اندر اختیار عطا کیا گیا ہے وہ بھی مشیت الٰہی کی بدولت ہے، اس لیے ایک لحاظ سے اس کے ہر عمل کی آخری علت مشیت ایزدی ہی ہے۔ لیکن خدا انسانوں کی اخلاقی تربیت اور ان کی سیرت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور یہ اختیار کے بغیر ممکن نہیں۔ دنیا میں آدم کی زندگی کا آغاز ہی اختیار کے استعمال سے ہوا۔ خدا نے اس کو شجر ممنوعہ کے قریب جانے سے منع فرمایا۔ آدم نے اپنی عقل اور اپنے اختیار کا غلط استعمال کیا۔ اس کے بعد پشیمان ہوا، اور خدائے رحیم نے اس کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ خلیفۃ اللہ فی الارض بنا دیا۔

آدمیت کا آغاز اختیار ہی سے ہے خواہ وہ اختیار غلط ہی کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ مادیت کے فلسفے نے انسان کو مجبورِ محض قرار دیا، مادہ اپنے کورانہ جبر پر عمل کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کا جسم اور اس کا نفس بھی مادّی ہے، اس لیے انسان کا ہر عمل اجرام فلکیہ کی رفتار کی طرح معین و مقدر ہے۔ کوئی شخص کسی حالت میں جو کچھ کرتا ہے، اس کا کرنا ہی لازمی تھا، کیونکہ مادّی علتیں لزوم کے ساتھ ساتھ اپنا معلول پیدا کرتی ہیں۔ اگر یہ نظریہ ہو تو اخلاق بے معنی ہو جاتے ہیں، مدح و ذم کا کچھ مطلب نہیں رہتا، جو نیک ہے وہ نیک ہونے پر مجبور ہے اور جو بد ہے وہ بد ہونے میں معذور۔ مادیت نفس کے مستقل وجود ہی کی منکر ہے اس لیے اس کے اندر اختیار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ روحانیت او والہیت اور توحید کے قائلوں نے بھی جبر کا مذہب اختیار کر لیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ چونکہ خدا علیم، قادرِ مطلق اور علت العلل ہے، اس لیے دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، اور انسان جو کچھ کرتا ہے، وہ ازل سے معین اور مقدر ہے۔ ان لوگوں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا کہ اگر یہ نظریہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو دین کی تمام تعلیم و تلقین مہمل ہو جاتی ہے دین امر الٰہی پر قائم ہوتا ہے۔ لیکن کسی مامور کو کسی ایسی بات کا امر کرنا جس کی استعداد اور قدرت ہی اس میں نہ ہو، ایک عبث بات ہے۔ مسلمانوں کی دینیات علم کلام اور ادبیات میں دوران انحطاط میں جبر کا عقیدہ مسلمات میں تسلیم کیا جانے لگا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سست عمل اور بدعمل لوگوں کو ایک عذر ہاتھ آ گیا کہ ہم کو ملامت کرو۔ ہم جو کچھ بھی ہیں خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں، اور جو کچھ ہم سے سرزد ہوتا ہے وہ مشیت ہی کے جبر کے ماتحت سرزد ہوتا ہے۔ میر کہتا ہے کہ ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

گویا مختاری انسان پر ایک تہمت ہے۔ اب انسان خدا پر تہمت لگاتا ہے کہ فعلِ بد کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے، اور خواہ مخواہ ہم بے گناہوں کو بدنام کرتا ہے۔ نہ صرف بدنام

کرتا ہے، بلکہ اپنے کیے کی سزا ہم کو دیتا ہے۔ کرے خدا اور پکڑا جائے انسان سے

در کوئے نیک نامی ما را گزر نہ دادند ۔۔۔ گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

حافظ بخود نہ پوشید این خرقۂ مے آلود ۔۔۔ اے شیخ پاک دامن معذور دار ما را

قرآن میں پیش کردہ اسلام نہ جبری ہے، اور نہ قدری۔ انسانی زندگی میں جبر بھی ہے اور اختیار بھی۔ ایک روایت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے دریافت کیا کہ انسان مجبور ہے یا مختار، وہ شخص کھڑا تھا، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اپنا ایک پاؤں زمین سے اوپر اٹھاؤ، اس نے اٹھایا اور ایک ٹانگ پر کھڑا ہوگیا۔ پھر فرمایا کہ اس کے ساتھ ہی دوسرا بھی اٹھا کر کھڑے رہو، اس نے کہا کہ یہ تو ناممکن ہے، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ فرمایا کہ بس اسی سے جبر و اختیار کے حدود کو سمجھ لو۔ آئین فطرت یہی ہے کہ خدا نے انسان کو خاص حدود میں اختیار دے رکھا ہے، اس کے باہر فطرت کے قوانین کا لزوم یا جبر عمل کرتا ہے۔ انسانی زندگی جبر اور اختیار کے بین بین ہے۔ انسان نہ مختارِ مطلق ہے اور نہ مجبورِ محض۔ جن باتوں میں اس کو اختیار دیا گیا ہے، اس کی ذمہ داری بھی اسی حد تک ہے۔ لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ قرآنی تعلیم یہ ہے کہ نفسِ انسانی آفاق کے آئین کے ساتھ وابستہ بھی ہے لیکن اپنی مستقل حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہ خاکِ زندہ تابعِ ستارہ نہیں۔ اب تو مادیت نے بھی جبرِ محض کا عقیدہ بہت کچھ ترک کر دیا ہے نہ مادہ قدیم مادیین کا مادہ رہا اور نہ مادیت کا فلسفہ پہلے انداز پر قائم رہ سکا۔ قدیم فلسفہ زیادہ تر جبری تھا، جس کے زیر اثر مسلمانوں کا بھی علم کلام جبریت کا شکار ہو گیا۔ جدید فلسفے میں برگساں نے خاص طور پر وجدان اور حکمت سے اس کا ثبوت مہیا کیا کہ زندگی کی ماہیت ہی آزادانہ تخلیق ہے، اور مادہ اس کے مقابلے میں ایک پس ماندہ چیز ہے جو حیاتِ تیز رو کے پاؤں پر بیڑی ہوئی ہوگر وہ اس کی رفتار کو معین نہیں کرتی۔ اسلام نے انسان کے وقار کو اس کے اختیار کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ جہاں اختیار نہیں وہاں اخلاقی ذمہ داری نہیں ہو سکتی، اور جو شخص اپنی زندگی اور اپنے ارادہ کا مالک نہیں ہے وہ حیوان سے بھی پست تر ہو جاتا ہے۔ توحیدِ اسلامی نے انسانوں کو موہوم معبودوں

اور دیوتاؤں کی غلامی سے چھڑایا۔ اور اس کو اس کا احساس دلایا کہ اس کا منصب مسجودِ ملائک اور مسخرِ کائنات ہونا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا وظیفۂ حیات خلافتِ الٰہیہ ہے جو جو قوتیں انسانوں کے جائز اختیارات کو سلب کرنے والی تھیں ایک ایک کر کے ان کا صفایا کر دیا۔ دیوتاؤں کے علاوہ انسان بھی انسانوں کے مالک اور رب بن بیٹھے تھے۔ غلامی اور استبداد کی تمام قسمیں پورے زور شور سے انسانی معاشرے میں عمل کر رہی تھیں۔ غلامی کی بدترین قسم ایک انسان کا دوسرے انسانوں کی جان و مال اور آبرو کا مالک ہونا ہے۔ یہ غلامی ہر قوم کی معاشرت کا ایک جزو لاینفک بن گئی تھی، شخصی اور معاشی غلامی تمدن اور معاشیات کا محور تھی، ارسطو جیسے حکیم نے بھی کہا کہ یہ ایک فطری چیز ہے جو منسوخ نہیں ہو سکتی ہے اور اسے منسوخ کرنا بھی نہیں چاہیے اسلام نے اس کو معاشرے کی ایک بیماری اور لعنت قرار دیا۔ چونکہ یہ مرض مزمن ہزار سال سے انسانیت کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اس لیے ایک روز میں اس کا قلع قمع کرنا محال تھا۔ اسلام نے اس کی تدریجی تنسیخ کا پروگرام بنایا۔ زیادہ تر غلامی جنگ میں اسیر ہونے سے پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کے متعلق یہ تعلیم دی کہ اسیرانِ جنگ کو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، یا احسان کر کے ان کو رہا کر دو، یا جنگی اسیروں کا تبادلہ کر لو۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے روز بعض لوگ ایسے مجرم ہوں گے، خدا جن کا منہ دیکھنا نہیں چاہے گا۔ ان میں سے ایک گروہ وہ ہوگا جس نے آزاد انسانوں کو غلام بنایا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے غلامی کی تدریجی تنسیخ پر عمل کرنا شروع کیا۔ اور حکم دیا کہ کوئی مسلمان غلام نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد فرمان جاری کیا کہ کوئی عرب غلام نہیں ہو سکتا۔ بعد میں جب خلافت سلطنت میں تبدیل ہو گئی اور قیصریت اور امرائیت کا دور دورہ ہوا تو اسلام کے اور پروگراموں کی طرح اس پروگرام پر بھی آگے قدم بڑھانا رک گیا اور فقیہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تلقین کی گئی ہے اور ان کے حقوق معین کر دیے گئے ہیں، لیکن غلامی کا منسوخ کرنا لازمی نہیں ہے۔

اسی سلسلے میں اسلام کے متعلق ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے، جس کو واضح کرنا

لازمی معلوم ہوتا ہے۔ ہر دین کسی قوم میں آتا ہے اور ہر نبی کسی قوم کا فرد ہوتا ہے۔ جس قوم میں کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے وہ قوم اپنا مخصوص مزاج رکھتی ہے۔ نبی کا کام ان کے عادات کو درست کرنا اور قبیح رسوم کا قلع قمع کرنا ہوتا ہے لیکن اصلاح کا کام اس قوم کے رسم و رواج، روایات و مزاج سے بالکل قطع نظر کر کے نہیں ہو سکتا۔ مصلح کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ قوم اپنی موجودہ حالت میں زیادہ سے زیادہ کتنی اصلاح کو قبول کر سکتی ہے۔ جس طرح فرد کی اصلاح میں تدریج برتنا پڑتی ہے، اسی طرح قوم کی اصلاح بھی بتدریج ہی ہو سکتی ہے۔ اصلاح کے متعلق مولانا حالی ایک نہایت حکیمانہ رباعی لکھتے ہیں ؎

دھونے کی ہے اے ریفارمر جا باقی　　کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پر اتنا نہ رگڑ　　دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں نبوت کے انداز اصلاح پر لکھا ہے کہ "دین کے کچھ ازلی اور ابدی اصول ہیں، نبی کا کام یہی ہے کہ ان اصولوں کو اپنی تعلیم اور اسوۂ حسنہ سے دل نشین اور قابل یقین بنائے۔ لیکن ہر نبی کو اس قوم کے مزاج کا لحاظ کر کے اصلاح کرنی پڑتی ہے جس قوم میں وہ مبعوث ہوا، لہذا جو قاعدے نبی رائج کرتا ہے ان میں بہت سی باتیں قومی مزاج کو مدنظر رکھ کر جاری کی جاتی ہیں۔ یہ قاعدے اور طریقے دین کا ازلی اور ابدی جزو اور اس کی ماہیت میں داخل نہیں ہوتے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ دوسری قوم پر جس کا مزاج روایات اور طریق زندگی بالکل مختلف ہو، یہ قواعد جوں کے توں قابل اطلاق نہیں ہو سکیں گے۔ کسی نبی نے اصلاح کا جو قدم اٹھایا اس کے حدود، روایات اور مزاج قومی سے متعین ہوئے اگر اس قوم یا اس زمانے میں مزید اصلاح کی صلاحیت ہوتی تو اصلاح کا ایک اور قدم آگے بڑھایا جاتا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے اس خیال کی بخاری شریف کی ایک حدیث سے تائید ہوتی ہے جس میں رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر میری قوم ایسی جاہل نہ ہوتی تو میں کعبے کے ایک حصے کی تعمیر کو ابراہیمی نقشے پر بناتا۔ مطلب یہ ہے

کہ اس شکست وریخت اور تجدید وتعمیر سے ان کے جاہلانہ جذبات کو دھکا لگے گا، لہٰذا میں نے اپنے ارادے کو ترک کر دیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتنی اصلاحی باتیں ایسی ہوں گی جن کے متعلق رسول کریمؐ نے سوچ سمجھ کر اتنا ہی قدم اٹھایا جتنا کہ ان کی قوم برداشت کر سکتی تھی۔ قوم کی برداشت اور اس کی تہذیبی اور تمدنی حالت سے زیادہ اصلاح کی تعجیلی کوشش نفع کے مقابلے میں نقصان پہنچا سکتی ہے، لیکن دین ازلی وہی ہو سکتا ہے جو زندگی کے انتہائی نصب العین کو معین کرے اور ہر اصلاح اس نصب العین کی طرف ایک بڑھتا ہوا قدم ہو۔ انسانی زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ وہ حسب استطاعت اخلاقِ الٰہیہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ تخلقوا باخلاق اللہ مومن کا لائحہ عمل ہے۔

اصول و اوامر

اسلامی تعلیمات کے دو پہلو ہیں، ایک اصول اور ایک اوامر۔ قرآن کریم نے اپنا نام قرآن حکیم رکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ در اصل حکمت کی کتاب ہے۔ حکمت اصل اور بنیادی حقیقت ہے اور احکام حسب ضرورت اس حکمت سے سرزد ہوتے ہیں تاکہ وہ حکمت تنظیم حیات میں بروئے کار آسکے۔ قرآن نے حکمت کو موعظت پر مرجح سمجھا ہے ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ جس شخص میں حکمت ادراک سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، اس کے ساتھ وعظ و نصیحت سے کام لیا جاتا ہے اور عمل کے لیے اوامر و نواہی اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس میں احکام کی تعداد بہت کم ہے اور اکثر احکام کے ساتھ اس حکمت کو بھی واضح کیا ہے جو کسی حکم کی علت ہے۔ اگر اوامر کی کثرت ہو جائے تو انسانوں کی جائز آزادی بھی بعض اوقات محدود ہو جاتی ہے۔ اسلام کی غرض یہ تھی کہ جہاں تک ہو سکے انسان خدا کو کائنات کے مشاہدے اور مطالعے اور تفکر و تدبر سے سمجھے اور خدا کے احکام کی حکمت بھی اس

پر واضح ہو۔ اسلام کی معاصر دنیا میں ادیان نے زندگی کو بہت محدود اور محصور کر رکھا تھا۔ اوامر و نواہی کی کثرت نے اصل دین کو فراموش کرا دیا تھا۔ متعصب شخص وہی ہوتا ہے جو اصل کو فراموش کر کے شرع ہی کو اصل سمجھ لیتا ہے اور کسی حکم کی علت اور حکمت کو سمجھے بغیر اس کی ظاہری صورت کی پابندی کو عین دین تصور کرتا ہے۔ اسلام نے دین کی یہ حقیقت بتائی کہ الدین یسر۔ دین آسانی کا نام ہے اور رسالت کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں نے جو توہمات، روایات اور رسوم کی زنجیروں سے اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے، ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے۔ احکام کی تعداد کم سے کم ہو اور زیادہ زور اصول پر دیا جائے۔ حکم کی محض ظاہری پابندی کر کے اس کے باطن اور اس کی حکمت سے غافل رہنے والوں کو تنبیہ کی جائے۔ عبادات کا مقصود بتایا جائے اور ان کے کچھ ارکان اور آداب معین کیے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی تاکید کے ساتھ یہ تلقین کی جائے کہ ارکان و آداب ذرائع ہیں، مقصود اصلی نہیں ہیں۔ نماز حقیقی وہ ہے جس میں حضورِ قلب ہو اور وہ فحشا و منکر سے انسان کو روک سکے اور انسان کی طبیعت میں اعمالِ صالحہ کی رغبت پیدا کر سکے۔ قیام و رکوع و سجود اور قبلہ رو ہونا حصولِ مقصد کے ذرائع ہیں۔ اگر اصل مقصد حاصل نہ ہو، تو اٹھنا بیٹھنا اور آیات کو طوطے کی طرح دہرانا اچھائی کی بجائے برائی کا باعث ہو سکتا ہے۔ چونکہ ارکان فی نفسہٖ مقصود نہیں ہیں، اس لیے ارکان کی پابندی میں اسلام نے ایسی شدت اور تنگی نہیں برتی کہ ارکان ذرا ادھر سے ادھر ہوں تو نماز ہی باطل ہو جائے، کھڑے ہو کر نماز کی ادائگی میں دقت محسوس ہو تو بیٹھ کر پڑھ لی جائے۔ بیٹھنے میں زحمت محسوس ہو تو لیٹ کر پڑھ لی جائے۔ آخر میں یہاں تک ہے کہ محض اشارات سے نماز ادا ہو سکتی ہے۔ نماز میں قبلہ رو ہونا، آدابِ صلوٰۃ میں سے ہے لیکن قرآن کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ لوگ محض کسی سمت ہی کو مقدس نہ سمجھ لیں اور اس کو جوہرِ صلوٰۃ میں داخل نہ کر لیں، اس لیے دو تین مرتبہ دہرا کر کہا کہ یہ آداب و ذرائع میں داخل ہے اور حقیقتِ نماز کا جوہر نہیں۔ آداب کی پابندی مفید ہے لیکن آداب کو آداب ہی سمجھا جائے۔ ان کو اصول

کا اہم وزن نہ بنایا جائے۔ وللہ المشرق والمغرب فاینما تولوا فثم وجہ اللہ
اور اللہ ہی کی ہے مشرق اور مغرب ہیں جس طرف تم منہ کر لو اسی طرف اللہ تعالیٰ کا رُخ
ہے۔ اصل چیز نیکیوں کی طرف سبقت کرنا ہے۔ نماز اور اس کے ارکان سب اسی
مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ولکل وجہۃ ھو مولیھا۔ فاستبقوا الخیرات۔
اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جدھر کو وہ اپنا منہ کرتا ہے۔ پس تم نیکیوں کی طرف
بڑھو۔

عبادات کی ظاہری صورتیں اور اطوار نیکی کا اصل مقصود نہیں ہیں، نیکی کی ماہیت یہ ہے کہ حقائق پر ایمان رکھتے ہوئے اعمال صالحہ پیدا کیے جائیں، رحم اور عدل اور ایثار اور صبر کی مشق کی جائے۔

نیکی یہی نہیں ہے کہ اپنا منہ مشرق و مغرب کی طرف کر لو، بلکہ اصل نیکی ان کی ہے جو اللہ اور آخرت اور فرشتوں اور کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے۔ اور جنھوں نے اللہ کی محبت میں قریبیوں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو اپنا مال دیا، اور غلامی سے لوگوں کی گردنوں کو چھڑانے میں مال صرف کیا، جو نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے، جب عہد کیا تو اپنے وعدے کے پورے رہے اور تنگی اور تکلیف اور خوف کے وقت صابر رہے۔ یہی لوگ سچائی والے اور پرہیزگار ہیں۔" (البقرہ ۲ آیت ۱۷۲)۔

اسلام کے مخالفوں بلکہ بعض مسلمان کہلانے والوں نے بھی اسلام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اس نے زندگی کی تمام جزئیات کو ایک اٹل نظام فکر و عمل میں جکڑ دیا ہے۔ یہ اعتراض حقیقت میں قرآن پر نہیں بلکہ ہماری فقہ کے بعض حصوں پر وارد ہوتا ہے۔ قرآن پر اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ مسلمان فقہا اور علما اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق تفصیلی احکام سے وقتاً فوقتاً تیار کرتے رہے۔ چونکہ یہ احکام متغیر حالات اور مختلف اذہان کا نتیجہ تھے، ان میں اکثر باتوں کے متعلق اختلاف رائے رہا۔ ہر ایک نے نیک نیتی سے جو کچھ صحیح سمجھا وہ فتویٰ دیا۔ جب تک مسلمانوں

پر وہی جمود طاری نہ ہوا، تب تک فقہا کے مذاہب کوئی اٹل چیز نہ تھے اور ائمہ فقہا میں کسی کا یہ منشا نہ تھا کہ لوگ ان کی تحقیقات اور ان کے فتاوی کو شریعت اسلامی کا ناقابل تغیر حصہ سمجھ لیں اور اس کے معصوم عن الخطا ہونے پر اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح کہ وہ قرآن پر ایمان لائے ہیں۔ انھوں نے احکام کو قرآن سے اخذ کرنے کی کوشش کی لیکن کہیں کہیں تاویلات پر اختلاف ہو گیا۔ احادیث نبوی سے احکام کے استنباط کی کوشش کی لیکن احادیث میں بہت کچھ اختلاف تھا، اس لیے سب فقہا کے لیے ان میں سے متوافق احکام کا استنباط کار دشوار تھا۔ جب مسلمانوں میں تفقہ کا فقدان ہو گیا تو عوام اور علمائے دین کہلانے والے سب بصر اور جامد لوگ پہلے فقیہوں کے پرستار ہو گئے اور وہی صورت پیدا ہو گئی جو قرآن کریم نے یہود کے متعلق بیان کی تھی کہ ان لوگوں نے اپنے احبار کو ارباب من دون اللہ بنا لیا۔ اس کے بعد لوگ مسلم کہلانے کی بجائے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کہلانے لگے۔ انھوں نے اپنے اماموں کے اختیارات اور فتاوی کو شریعت اسلامیہ کا جزو لاینفک سمجھ لیا۔ اجتہاد اور اجماع قیاس اور امتحان سب کا دروازہ بند ہو گیا۔ اسلام کی شریعت بھی منو کا دھرم شاستر بن کے رہ گئی۔

قرآن کریم میں جو اصول دین ہیں، وہ وحی الٰہی اور ابدی اسلام ہیں، اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ وقتی اجتہاد ہے جو زمانے کی ضروریات کے ساتھ بدل سکتا ہے۔ اگر اسلام ابدی دین ہے تو اس میں ایسی تفصیلات دین کا جزو لاینفک نہیں بن سکتیں جو تمدن اور معاشرت کی کسی خاص صورت سے متعلق تھیں۔ اسلام نے جو اصلاحیں کیں ان میں سے بعض ایسی تھیں جو معاصرانہ معاشرت کی کسی ہیئت کو مدنظر رکھ کر کیں۔ رسول کریم نے اسلام کی تلقین میں بھی تدریج کے اصول کو مدنظر رکھا اور اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا کہ اسلام کی مکمل اور انتہائی صورت کسی ایک فرد یا قوم میں یکدم پیدا نہیں ہو سکتی جب کسی قوم میں کسی صحابی کو عامل اور والی بنا کر بھیجتے تھے تو اسے فرماتے تھے کہ پہلے ان سے فقط یہ کہنا کہ خدا ایک ہے، جب توحید ان کی سمجھ میں آ جائے تو پھر اس کے بعد نماز کی تلقین کرنا اور اس کے بعد زکوٰۃ دینے کو کہنا۔ اسلام میں جو تدریج افراد

دور اقوام کے متعلق زمانۂ رسالت میں درست تھی وہ بعد کے آنے والے تمام زمانوں کے متعلق بھی درست ہے۔ اسلام نے شروع میں جو اصلاحیں کیں وہ اصلی مدارج کے سفر میں بمنزلہ مراحل و منازل کے ہیں۔ اسلام کے متعلق صحیح نقطۂ نظر یہی ہے کہ اس کی ہر اصلاح انسان کی آخری ہیئتِ فلاح نہیں بلکہ سرِ راہ ایک منزل ہے۔ انسان کو خدا تک پہنچنے کے لیے لاتعداد منازل کو طے کرنا ہے۔

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

مولانا روم ؒ ایک شعر میں مومن کی منزل کے متعلق فرماتے ہیں کہ "منزلِ ما کبریاست" علامہ اقبال ؒ فرماتے تھے کہ مسلمانوں نے اسلام کو کسی ایک زمانے کی معاشرت کا مرادف سمجھ لیا ہے۔ زندگی ارتقا پذیر چیز ہے اس کی آنے والی صورتیں نئے نئے آئین کی متقاضی ہوں گی، اسلام غایتِ حیات اور نصب العین کا نام ہے۔ صراطِ مستقیم پر چلتے ہوئے انسانی زندگی کے کیا کیا سانچے بدلے گا، تصور میں بھی اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مولانا چراغ علی مرحوم شریعتِ اسلام پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب "مقدمہ تحقیق الجہاد" میں لکھتے ہیں: "ہمارے مخالف ان ہی عارضی احکام یا رعایتوں پر اڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام نے ان نامکمل احکام اور جزوی اصلاحوں کو ایک دائمی اور غیر متغیر قانون بنا دیا ہے۔ جن پر اعلیٰ درجے کی اصلاحوں کی گنجائش نہ رہی اور جو ترقی کرنے والے اور شائستہ تمدن کے لیے ایک زبردست روک ہیں۔ آنحضرت کے مفصلہ ذیل احکام میری نظر میں ہیں۔ عورتوں کی ذلیل حالت کی اصلاح۔ غیر محدود تعداد ازدواج کی تحدید۔ طلاق کی آسانی اور لونڈی، غلام بنانا۔ آنحضرت کے تمام احکام عام اس سے کہ وہ چند روزہ اور عارضی تھے یا قطعی اور دائمی، جو ان تمدنی خرابیوں کے رفع کرنے کے لیے دیے گئے تھے، وہ باہم ملے جلے اور مختلف سورتوں میں جابجا پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ترتیب نزول کے موافق مرتب نہیں ہوئے۔ اس لیے جو لوگ قرآن کریم کے مضامین پر عمیق نظر نہیں رکھتے ان کے لیے اس بات کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہے کہ کون سے احکام بمنزلہ درمیانی منزل کے ہیں

اور کون سے احکام آخری اور بجائے منزلِ مقصود کے ہیں۔ عام قانون کے مدوّن کرنے والوں (فقہا اور مجتہدین) سے کسی قدر ساختت ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول تو وہ ملکی احکام جو عارضی اور بمنزلہ اس درمیانی قدم کے تھے جو اعلیٰ اصلاح کی طرف لے جاتا ہے، آخری اور قطعی سمجھے گئے، اور ثانیاً وہ ملکی احکام جو صحرائے عرب کے باشندوں کے مناسب حال تھے تمام زمانوں اور ملکوں کی گردن پر ان کا بار ڈالا گیا۔"

پہلی قومیں کھانے پینے کی چیزوں میں حلال اور حرام کو دین کا نہایت اہم جزو سمجھتی تھیں۔ ہر مذہب اور تہذیب میں کھانے پینے کے متعلق کچھ چیزیں طیب اور غیر طیب سمجھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات ان کو ایسا سمجھنا کسی حکمت یا تجربے کی بنا پر ہوتا ہے اور بعض اوقات اس کی تہ میں قومی عادات اور روایات ہوتے ہیں جن کے اندر حکیمانہ اصول کو تلاش کرنا دشوار ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے دو تین چیزوں کو غیر طیب قرار دے کر باقی سب کے متعلق ایک عام معقول اصول بیان کر دیا کہ تمام طیبات حلال ہیں یعنی تمام ایسے اطعمہ حلال ہیں جو تجربے سے اور طب کے اصول کے موافق جسمانی و نفسی زندگی کے لیے مفید ہوں۔ لیکن جس طرح ارکان صلوٰۃ کے متعلق یہ واضح کر دیا کہ اس سمت یا اُس سمت میں منہ کرنا ہی نیکی نہیں ہے، اسی طرح قرآن کریم نے یہ تعلیم دی کہ اصل حلال و حرام جس پر زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے اس کا تعلق ایمان اور بے ایمانی اور نیکی اور بدی سے ہے۔

قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم الا تشرکوا بہ شیئاً و بالوالدین احساناً ولا تقتلوا اولادکم من خشیۃ املاق نحن نرزقکم وایاھم ولا تقربوا الفواحش ما ظھر منھا وما بطن ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ذٰلکم وصّاکم بہ لعلکم تعقلون (الانعام ۶۔ آیت ۱۵۲)۔

اے پیغمبر! (لوگوں سے کہو) کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جو تمہارے پروردگار نے تم پر حرام کی ہیں وہ یہ ہیں کہ کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ اور ماں باپ کے

ساتھ احسان کرو، اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، تم کو اور ان کو ہم ہی رزق دیتے ہیں، اور بے حیائی کی باتیں جو ظاہر اور پوشیدہ ہیں اُن کے پاس نہ جانا، اور جس کی جان لینے کو اللہ نے حرام کیا ہے، اس کو ناحق قتل نہ کرنا۔ یہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو۔

اسی مضمون کے قریب قریب سورۂ اعراف میں بھی ہے کہ اصل حرام باتیں تو بے حیائی کی باتیں ہیں، ظاہر اور پوشیدہ گنہگاری اور ناحق دوسروں کے خلاف زیادتی کرنا اور ایسی باتوں کو خدا کی طرف منسوب کرنا جن کے لیے کوئی سند نہیں اور جن کا تمہیں کوئی علم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حلال و حرام کا تعلق ایمان اور اخلاق سے ہے، کھانے پینے اور دیگر رسوم و عادات اور آداب عبادات کے متعلق جو باتیں ہیں وہ ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس نے ظاہری یا ثانوی حیثیت پر زور دیا اور اصل کو بھول گیا، ایسا ظاہر پرست حقیقی روحانیت سے بیگانہ ہو جاتا ہے ؎

زاہدِ ظاہر پرست از حالِ ما آگاہ نیست

در حقِ ما ہر چہ گوید جائے ہیچ اکراہ نیست

اللہ تعالیٰ زبردستی تمام انسانوں کے اطوار و عادات کو یکساں اور یک رنگ بنانا نہیں چاہتا۔ دین کا اصل مقصد نیکی کی طرف سبقت کرنا ہے لکل جعلنا منکم شرعة ومنهاجاً و لو شاء الله لجعلكم امة واحدة و لكن ليبلوكم في ما آتاكم فاستبقوا الخيرات۔ ہم نے تم میں سے ہر گروہ کے لیے ایک شریعت اور ایک راستہ مقرر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو (تمام نوع انسان میں عبادات و رسوم کی یک رنگی پیدا کر کے) سب کو ایک امت بنا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔ ہر طریقے میں انسانوں کی آزمائش ہو سکتی ہے نیکی اور بدی کی گنجائش ہر طریقے میں نکل سکتی ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ تمام انسان نیکیوں کی طرف سبقت کریں، خصوصاً اے مسلمانو! تمہیں دین کی اس اصل غایت اور نصب العین کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ایمان اور عقل

اسلام کسی ایسے عقیدے کی تلقین نہیں کرتا جو عقل اور مشاہدۂ انسانی کے منافی ہو۔ نبیوں کے اندر ایمان محض عقل اور استدلال سے پیدا نہیں ہوتا، کائنات و حیات کی حقیقت ان پر براہ راست منکشف ہوتی ہے، لیکن جو کچھ ان پر منکشف ہوتا ہے، وہ ایسا نہیں ہوتا کہ انسانی عقل یا انسانی فطرت اس کی تائید نہ کر سکے۔

اسلام دین کو فطرت قرار دیتا ہے اور فطرت اس کو کہتے ہیں جو ہر جگہ اندر اور باہر جاری و ساری ہے۔ ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ لیکن خدا جو حقیقت کلی ہے وہ فرماتا ہے کہ میں ہی ظاہر اور میں ہی باطن ہوں۔ چونکہ خدا کی ذات و صفات میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس لیے ظاہر اور باطن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ اسلام وحدت کا دین ہے اس لیے وہ حیات و کائنات میں کسی اساسی تضاد کا قائل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی تعلیم میں وحی اور عقل میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ جو بات بھی از روئے وحی کی جاتی ہے اس کے متعلق یہ بھی دعویٰ ساتھ ہی ہوتا ہے کہ اے انسانو! اگر تم عقل سے کام لو اور جہالت و تعصب سے اپنی چشم بصیرت کو نابینا نہ کر لو تو تم اس بات کو حقیقت سمجھو جو تمھارے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ دین ایمان بالغیب کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ حیات لامحدود ہے۔ جس طرح ہر ظاہر کا ایک باطن ہے، اسی طرح ہر حاضر کے ساتھ غائب بھی ہے، حاضر کم اور غائب زیادہ۔ لیکن اسلام اس ایمان کا متقاضی ہے کہ کوئی انسان اپنے محدود موجودہ تجربے کو حقیقت کلی نہ سمجھ لے اور یہ عقیدہ رکھے کہ غائب حاضر سے متضاد نہیں ہے اور ہر حاضر ایک غائب کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی کڑیاں اسی حاضر کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ تمام حکمت حاضر سے غیب کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ سائنس کے دریافت کردہ قوانین کی صحت کا معیار بھی یہی ہے کہ جو حوادث ابھی بطن مستقبل میں ہیں اور ظہور پذیر نہیں ہوئے ان کے متعلق پیش گوئی کی جا سکے۔ سائنس نے موجودات کے ایک حصے کا مطالعہ کر کے اور اس کے قوانین دریافت کر کے یہ ایمان قائم کر لیا ہے کہ کائنات کے

طبیعی پہلو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ لامحدود اور نامعلوم کائنات بھی انھیں قوانین کی پابند ہے جو ہماری عقل اور تجربے میں مسلّم قرار پاچکے ہیں۔ سائنس کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ حاضر کا صحیح علم غیب سے غیر متوافق نہیں ہوسکتا۔ انفس و آفاق کے عوالم الگ الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح وحی و الہام اور عقل میں بھی کوئی تضاد نہیں۔ علوم طبیعی اور ریاضیات کے بعض ماہرین نے انکشافات کے متعلق اپنے نفسی تجربات بیان کیے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اپنے علم کے متعلق ان کو بے سعی و کوشش اور بے استدلال ایک الہام ہوا چونکہ وہ دلائل سے پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے اس کے ثبوت میں کوئی دلائل ان کے پاس موجود نہ تھے، اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عرصۂ دراز تک بعد میں استدلال کرنا پڑا۔ استدلال اور تجربے نے اس کو صحیح ثابت کیا۔ انبیاء کی وحی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ از روئے وحی زندگی کے بعض اہم حقائق ان پر منکشف ہوتے ہیں۔ عام انسانوں کی عقل کو ان تک پہنچنے میں بہت دیر لگتی ہے لیکن جب عقل اور انسانی تجربہ ان تک پہنچ جاتا ہے تو وحی سے حاصل شدہ حقائق عین حکمت معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک انسان موردِ وحی و الہام نہیں ہو سکتا، جس طرح ہر شخص سائنس میں نیوٹن اور آئن اسٹائن نہیں بن سکتا۔ عام لوگ اور معمولی سائنسدان ان ماہرین کے انکشافات پر اعتبار کر کے تدریجاً عقل اور تجربے سے ان کی تصدیق کے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جس قدر سائنس ترقی کرتی ہے، وہ اس ماہر کے الہام کی تصدیق کرتی جاتی ہے۔ قرآن عام انسانوں سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ تم کسی بات کی سچائی کو عقل اور مشاہدے اور تجربے سے پرکھو۔ کائنات کا بغور مطالعہ کرو تو تم کو اس کی کثرت ایک وحدت میں منسلک نظر آئے گی۔ تمھارے پاس عقل اور مشاہدے سے بالاتر ذرائع تحقیق نہیں ہیں، لہٰذا تم انھیں سے کام لو۔

اسلام سے قبل اکثر مذاہب نے اپنی بنیاد ایسے عقائد پر رکھی تھی جو نہ کسی کی عقل میں آسکتے تھے اور نہ کسی کے مشاہدے میں۔ کسی نے توحید و تثلیث کا معما پیش کیا، کسی نے ایمان کی بنیاد تمام تر معجزات پر رکھی جن کے سمجھنے میں انسانی عقل عاجز ہو، قرآن نے

یہ عقیدہ پیش کیا کہ ایمان کو خدا کی عبادت اور سنت سے اخذ کرنا چاہیے۔ لوگ اپنی پرانی عادت سے معجزہ طلب کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں قرآن تمام کائنات اور اس کے ہر شعبے کو مشیت و قدرت الٰہی کا اعجاز قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو زمین سے چیزیں کس حکمت اور جمال کے ساتھ اُگتی ہیں، ستارے کیسے اپنے مداروں میں حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں، اونٹ کے اعضا اور ماحول کے ساتھ ان کے توافق پر غور کرو۔ فطرت پر غور کرنے سے تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ اس میں کوئی چیز عبث نہیں ہے، کوئی عمل بے معنی نہیں ہے، کوئی فعل بے مقصود نہیں ہے، کوئی حادثہ بے آئین نہیں ہے جس کو تم اتفاق کہتے ہو اس کا کہیں وجود نہیں۔ خدا کی مشیت سراپا عقل، سراپا عدل اور سراپا رحمت ہے۔ علم کی کمی ہوتی ہے تو بعض حوادث بے آئین معلوم ہوتے ہیں لیکن علم کی وسعت کے ساتھ نا فہمیدہ بھی فہم کے حدود میں آجاتا ہے۔ کائنات سراپا اظہار بھی ہے اور سراپا اعجاز اور راز بھی۔ ظہور سے بطون کی طرف ترقی کرنا حکمت بھی ہے اور دین بھی ؂

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ
ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

اسلام کے قبل بھی ایسا تھا اور اس کے بعد اکثر لوگ خرقِ عادات میں خدا کی قدرت کو ڈھونڈتے ہیں۔ اسلام کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے انسانوں میں یہ بصیرت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ جو کچھ روز ان کے سامنے ہوتا ہے اس میں خدا کی حکمت کو تلاش کریں۔ کائنات خدا کا صحیفۂ قدرت ہے، جو شخص اس صحیفے کو پڑھ کر معرفت نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے لیے کوئی دوسرا طریقہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ جس کو برگ درخت سبز معرفت کردگار کا دفتر نظر نہیں آتا اس کے اندر رسی کو سانپ بنانے سے ایمان پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو شخص مطالعہ فطرت میں اندھا ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ نبی معلم ہوتا ہے وہ ساحر نہیں ہوتا۔ خدا اس کے ذریعے سے لوگوں کو حیران اور مرعوب کرنے والے مظاہر فطرت پیش کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کرتا اور کہتا ہے

کہ اس سے ایمان آفرینی نہیں ہو سکتی۔ جس شخص کے دل میں ایمان صحیح راستے سے داخل نہیں ہوا، وہ ایسے معجزات کو دیکھ کر ھذا سحرٌ مبین کہہ کر بے ایمان کا بے ایمان ہی رہے گا۔ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس نے دین کو فطرت کہا اور حکمت کو خیرِ کثیر قرار دیا اور عقل کو وحی کا مؤید بنایا، مشاہدۂ حاضر کو ایمان بالغیب کے حصول کا ذریعہ بنایا اور دین و دانش کے تضاد کو بے عقلی کا نتیجہ سمجھا۔ جن ادیان کا یہ عقیدہ نہیں تھا وہ فطرت کی طرف رجوع کرنے سے گھبرائے، علوم و فنون کی ترقی کو اپنے منافی سمجھ کر ان کی راہ میں مزاحم ہوئے۔ اسلامی تہذیب میں علوم و فنون کی ترقی اسلام کے بنیادی عقائد پر کوئی ضرب نہ لگا سکی۔ طبیعی قوانین، نفسی قوانین، خیر و شر کے قوانین سب از روئے اسلام سنت اللہ ہیں اور فطرت اللہ ہیں، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ولن تجد لسنة الله تبدیلا۔ ان قوانین کو دریافت کرنا حکمت کہلاتا ہے اور قرآن نے اپنے آپ کو حکمت کی کتاب کہا ہے۔ اس حکمت کے مطابق جو عمل ہوگا، وہ عملِ صالح کہلائے گا اور جو زندگی اس کے مطابق ہوگی وہ حیاتِ طیبہ ہوگی۔ جس طرح فطرت لامتناہی ہے، کسی فرد یا قوم کے لیے کسی ایک وقت کا علم کافی نہیں ہو سکتا، اسی لیے مومن کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ ربِّ زدنی علماً۔ یہ دعا نبی بھی کرتا ہے اور اُمتی بھی، کیونکہ نبی کا علم بھی کسی حالت میں علمِ کُل نہیں ہوتا۔ دوسروں کے مقابلے میں اس کا علم بے شمار زیادہ ہے لیکن علم کی لامتناہی وسعت کے مقابلے میں نبی بھی اس کو ہمیشہ کم پاتا ہے اور اس میں اضافے کی دعا کرتا رہتا ہے۔ ادیان کو لوگوں نے غلط طریقے سے پیش کیا، اس لیے بعض حکمت پسند لوگ دین سے بیزار ہو گئے۔ لیکن جو دین اپنے آپ کو حکمت اور فطرت کا مرادف قرار دے، لوگوں کو تفکر اور تدبر کی دعوت دے، اس سے بیزار ہونے کے کیا معنی۔ مسلمانوں نے بھی بہت سے توہمات کو جزوِ دین سمجھ لیا ہے۔ بالغ نظر حکیمانہ مزاج رکھنے والے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ توحید کے خالص عقیدے کو اصلِ دین سمجھیں اور قرآن نے حیات و کائنات کے متعلق اس عقیدے سے جو کچھ بطور نتیجہ اخذ کیا ہے اسی کو حکمت سمجھیں اور اسی کو لائحۂ عمل بنائیں۔ اسی حقیقت کا نام اسلام ہے اور

باقی سب فسون و فسانہ ہے

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت رہِ فسانہ زدند

اسلام میں گناہ کی ماہیت

اسلام نے مذہب میں جو انقلابی باتیں کیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے گناہ کی حقیقت بتائی۔ اسلام سے قبل مذاہب کا یہ حال تھا کہ ان میں سے اکثر نے زندگی کو سراپا گناہ بنادیا تھا، یا گناہ کا خوف اس طرح نفوس پر طاری کر ایا تھا کہ لوگ گناہ کے ڈر سے زندگی ہی سے گریزاں ہو گئے تھے۔ بدھ مت نے زندگی کی ہر آرزو کو گناہ قرار دیا اور اس کا یہ علاج بتایا کہ زندگی کو مطلقاً بے آرزو کر دیا جائے۔ ہندو دھرم نے یہ سکھایا کہ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے لاتعداد جنم لینے پڑتے ہیں اور یہ آواگون ایسا ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی روح اس سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے بار بار دنیا میں کبھی چوہا بن کر، کبھی گدھا بن کر، کبھی سؤر بن کر اور کبھی کتا بن کر آنا پڑے گا۔ دنیا میں جو بے شمار جانور اور حشرات الارض موجود ہیں، ان میں سے معلوم نہیں کتنے انسانوں کی روحیں ہیں جن کی گناہوں کی پاداش میں یہ تبدیل ہیئت ہو گئی ہے۔ یہودیوں میں بھی گناہ کے تصورات نہایت خوفناک تھے۔ انھوں نے گناہ کو ایسا ہیبت ناک بنادیا کہ نطشے لکھتا ہے کہ گناہ کا یہ تصور خاص یہودیوں کی ایجاد ہے۔ یہودیوں کے ہاں خدا اس قدر منتقم اور کینہ توز ہے کہ گناہ کی سزا فقط گناہ کرنے والے تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ آنے والی تین پشتوں کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ تصور مطلق العنان جابر بادشاہوں کے متعلق تھا جس کو یہودیوں نے خدا پر لگا دیا۔ جابر سلطان جس شخص سے ناراض ہوتے تھے، سزا فقط اسی کو نہیں ملتی تھی، بلکہ اس کا پورا خاندان یا قتل کر دیا جاتا تھا، یا صالح اور معصوم سب کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ توریت میں ہے کہ خدا کہتا ہے "میں خدا تیرا مالک خدا ایسے غیور ہوں، جو لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ یہ برتاؤ کرتا ہوں کہ آبا کے گناہ کا

عذاب تیسری چوتھی پشت تک اس کی اولاد کو بھی دیتا ہوں۔" یہودیوں کا گناہ کی بابت یہ تصور کہ وہ اولاد کو ورثے میں ملتا ہے، عیسائیت کا بھی ایک اساسی عقیدہ بن گیا۔ آدم اور حوا نے جنت میں جو شیطان کے ورغلانے سے شجرِ ممنوعہ کا پھل کھایا، اس کی سزا یہیں تک محدود نہ رہی کہ ان کو جنت سے نکال دیا گیا، بلکہ ابدالآباد تک ان کی اولاد کو اس کی سزا ملتی جائے گی اور دنیا میں جو انسان بھی پیدا ہوگا، آدم کا گناہ اس کی فطرت کا جزو ہوگا۔ قیامت تک تمام عورتوں کو یہ سزا ملے گی کہ بڑی مصیبت سے بچے جنیں۔ مردوں کی سزاؤں میں سے ایک سزا یہ ہوگی کہ ان کو محنت کے پسینے سے روٹی کمانی پڑے گی۔ اعمالِ صالحہ سے بھی گناہ کی یہ سیاہی دھل نہ سکے گی۔ یہ کہ ایک کے گناہ کی سزا دوسرے کو مل سکتی ہے وہ اس دوسرے مسیحی عقیدے میں بھی موجود ہے کہ مسیح کی مصیبت اور موت انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ہوگئی۔ انسانوں کے گناہوں کا علاج خدا نے یہی کیا کہ اپنے اکلوتے اور معصوم بیٹے کو صلیب پر چڑھا دیا۔ اس عقیدے میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کا انسانی قربانی کا تصور بھی پایا جاتا ہے اور یہودیوں کا یہ عقیدہ بھی موجود ہے کہ گناہ گار کی سزا معصوم کو بھی مل سکتی ہے۔ ان عقائد کو دیکھیں تو یہودیوں اور عیسائیوں کا خدا نہ عادل معلوم ہوتا ہے اور نہ رحیم، وہ یا جابر سلطان ہے یا وحشیوں کا خونخوار دیوتا۔

اب ان تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی تعلیم پر غور کیجیے کہ اس نے گناہ کو کیا چیز سمجھا۔ انسان میں کئی قسم کی فطری صلاحیتیں ہیں، وہ احسنِ تقویم بھی ہے اور گناہ کرتے کرتے اسفل السافلین میں بھی گر سکتا ہے۔ قرآن نے بھی آدم کا قصہ بیان کیا لیکن یہ کہا کہ آدم سے ایک لغزش ہوئی، اس نے معافی مانگی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ اس کے بعد آدم کی تذلیل نہیں بلکہ اس کی تکریم ملتی ہے، اس کو خدا کا سب سے بڑا انعام یعنی نبوت عطا ہوئی اور نبوت کے ساتھ اس کو خلافتِ الٰہیہ کا اہل بنایا گیا۔ علم کی بدولت مسجودِ ملائک ہوگیا۔ شمس و قمر اور شجر و حجر کو اس کے لیے مسخر کیا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ آدمی کی فطرت ہے کہ وہ ضرور غلطی کرے گا اور جا بجا ٹھوکر کھائے گا۔ خدا نے اس کو دو نوں

راستے بتا دیے ہیں، وہ کبھی صراط مستقیم کو اختیار کرے گا اور اس کا انعام پائے گا اور کبھی راہ راست سے بھٹک جائے گا تو سزا کا مستوجب ہوگا۔ لیکن خدا انسان کو ہر وقت ہر گناہ پر نہیں پکڑتا، وہ مواخذہ کرنے میں عجلت نہیں کرتا۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر خدا سزا میں زود انتقام ہوتا تو دنیا میں انسان کیا کسی جاندار کا قائم رہنا محال ہوجاتا۔ خدا تواب الرحیم ہے، ہزار بار گناہ کرو اور ہزار بار توبہ کرو تو گناہ کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ ایک کا گناہ دوسرے کو ورثے میں نہیں ملتا، نہ ایک شخص دوسرے کے اعمال کا کفارہ ہوسکتا ہے لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ گناہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ قضائے مبرم کی طرح انسان کو چمٹ جائے۔ انسان کی زندگی یہ ہے کہ وہ بھلائیاں بھی کرتا ہے اور برائیاں بھی بھلائیاں برائیوں کو مٹاتی رہتی ہیں۔ ان الحسنات یذھبن السیات۔ انسان کو خدا کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔ اللہ کی رحمت ہر چیز اور ہر عمل پر چھائی ہوئی ہے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ — گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست — صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جنت اور دوزخ میں جزا اور سزا کے تشبیہی بیانات ہیں۔ جنت کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے کہ جنت کی مثال یہ ہے کہ گویا ایک باغ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت کی اصل کیفیت جو کچھ ہے، وہ نہ کسی نے آنکھوں سے دیکھی نہ کانوں سے سنی نہ کسی کے قلب میں اس کا تصور گزرا۔ قرآن کہتا ہے کہ جنت تمام ارض و سماوات یعنی تمام موجودات کی ہم وجود اور ہم وسعت ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جنت کوئی مکان یا مقام نہیں بلکہ انفس و آفاق کی ایک کیفیت ہے۔ اس خیال کی تائید رسول کریمؐ کے اس جواب سے بھی ہوتی ہے جو آنحضرتؐ نے حبش کے ایک سفیر کو دیا۔ جب اس نے پوچھا کہ جنت اگر تمام ارض و سماوات پر حاوی ہے تو جہنم کہاں ہوگا، فرمایا کہ جب دن طلوع ہوتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دن اور رات عالم ارضی کی کیفیتیں ہیں اور جگہ گھیرنے والی اشیا نہیں، یہی حال جنت اور دوزخ

کا ہے جس پر خدا کی عالمگیر رحمت آشکار ہو جائے، اس کے لیے تمام وجود خیر ہی خیر ہے، اور جس پر یہ رحمت آشکار نہ ہو، اس کی سلبی کیفیت کا نام دوزخ ہے۔ گویا جنت اور دوزخ حالتیں ہیں جو عرفان اور عدم عرفان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ کوئی مخصوص مقامات نہیں۔ زمان و مکان کا تعلق عالمِ طبیعی سے ہے، عالمِ طبیعی سے ماوراء نہ یہ زمان ہوگا، اور نہ یہ مکان، نہ یہ دیر و زود اور نہ یہ طول و عرض۔ علامہ اقبالؒ نے فکرِ اسلامی کی جدید تشکیل کے خطبات میں جنت اور دوزخ کے متعلق یہی لکھا ہے کہ یہ مقامات نہیں بلکہ احوال ہیں۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ بھی فرماتے ہیں کہ عالمِ مثال میں نفسی کیفیات اور مجرد تصورات جسمانی اور مادی صورتوں میں رونما ہوتے ہیں۔ جنت اور دوزخ کی قرآنی مثالوں کو بھی اس نظریہ کے مطابق احوالِ نفسی کی صورت پذیری قرار دے سکتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ قرآن خدا کے غضب کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس کے رحم کا بھی، خدا میں جلال بھی ہے اور جمال بھی، لیکن جلال ذریعہ ہے اور جمال مقصد۔ رحیمیت اور رحمانیت خدا کے اساسی صفات ہیں۔ ایسا خدا اگر سزا بھی دے تو تہذیبی ہی ہو سکتی ہے، تعذیبی نہیں ہو سکتی۔ خدا کی دی ہوئی سزا ایک عملِ جراحی ہے جس میں تکلیف ضرور ہے لیکن وہ ایک اصلاحی عمل ہے، اور اس کا عمل راحت کا پیش خیمہ ہے۔ گنہگاروں بلکہ منافقوں کے متعلق بھی رسولِ کریمؐ کو یقین تھا کہ گناہوں کی کثرت کے باوجود خدا ان پر مغفرت کر سکتا ہے۔ رسولِ کریمؐ نے بعض اصحاب سے دریافت کیا کہ بتاؤ کہ کوئی ماں اپنے بچے کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال سکتی ہے، انھوں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے، فرمایا کہ یقین رکھو کہ ماں کو جو محبت اپنے بچے سے ہے، اس سے کہیں زیادہ خدا کو اپنے بندوں سے ہے۔ جو سزا رحمت سے سرزد ہو وہ رحمت کی منافی نہیں ہو سکتی۔ ماں باپ تادیب اور تہذیبِ نفس کی خاطر اولاد کو سزا دیتے ہیں، استاد شاگرد کو سزا دیتا ہے، لیکن یہ سزائیں اصلاحی ہوتی ہیں، انتقامی نہیں ہوتیں۔ سزا پانے والے کی تکلیف سے سزا دینے والے کو خود بھی تکلیف ہوتی ہے۔

گناہ کے متعلق اسلام نے جو نقطۂ نظر اختیار کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ

اس نے گناہ گاروں کے لیے گناہ کرنے کے دروازے کھول دیے ہیں۔ دین کا کام گناہ کی تخریبی کیفیت اور اس کے دردناک نتائج کو واضح کرنا ہے جو ازروئے قرآن ایک نفسی مرض ہے، ایک قلبی بیماری ہے، لیکن جس طرح خدا نے ہر جسمانی بیماری کا علاج پیدا کیا ہے اسی طرح ہر قلبی بیماری کا علاج بھی ہے اگر بیماری ہوتی اور اس کا علاج نہ ہوتا تو اللہ کی رحمت پر شبہ ہو سکتا تھا۔ غالب نے اس مضمون کو کیا عمدگی سے بیان کیا ہے۔ کہتا ہے کہ ادویات، جمادات اور نباتات میں سے بنتی ہیں اور بیماریاں جانداروں کو ہوتی ہیں۔ تدریج تکوین میں خدا نے جمادات و نباتات کو تمام جانداروں اور انسانوں سے پہلے پیدا کیا، گویا علاج پہلے پیدا کیا اور بیماری بعد میں آئی، اس سے خدا کی رحمت کا پتہ چلتا ہے ؎

چارہ در سنگ و گیاہ و رنج با جاندار بود
پیش ازاں کیں در رسد آں را مہیا ساختی

ہاں اگر کوئی انسان اپنی بیماری نہ سمجھے تو علت و معلول کے عام قانون کے مطابق اس کی بیماری میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ فی قلوبھم مرضٌ فزادھم اللہ مرضاً گناہ یعنی قلبی مرض کا جلد علاج ہو سکتا ہے، بشرطیکہ مریض اس کو مرض سمجھے، خود اس کی تشخیص کرے یا روحانی اطباء سے اس کی تشخیص کرائے اور جلد اس کا مداوا کرے۔ اگر ایسا نہیں کرے گا تو قدرتی اضافۂ مرض اس کی زندگی کو جہنم بنا دے گا۔

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں (مسدس حالی)

جب گناہ اصرار اور تکرار کی وجہ سے مرض مزمن بن جائے تو گناہ چونکہ قلبی بیماری ہے، اس لیے قلب پر سے دوزخ کے شعلے اٹھنے لگتے ہیں۔ دوزخ کی آگ کوئی خارجی مادی آگ نہیں ہے، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ وہ آگ ہے کہ تطلع علی الافئدہ؟

یعنی دلوں میں سے شعلہ افگن ہوتی ہے۔ لیکن اتنی شدید گناہ گاری اور عذاب آفرینی کے باوجود بھی نہ توبہ کا دروازہ بند ہوتا ہے اور نہ رحمت کا دروازہ۔ خدا اسے توّاب و رحیم منتظر رہتا ہے کہ یہ عاصی گناہ سے منہ موڑ کر میری طرف رخ کرے۔ ایک سچی توبہ زندگی کا یک بیک رخ پھیر کر جہنم سے جنّت کی طرف لے جاسکتی ہے۔

اسلام نے انسان کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا کہ خطا و نسیان اس کے ساتھ لگا رہے گا اور زندگی کا گہوارہ بھلائی اور برائی کے درمیان جھولتا رہے گا۔ زندگی کی عام لغزشیں ایسی نہیں ہوتیں کہ انسان خدا کے خوف اور عذاب کے ڈر سے ہمیشہ لرزہ براندام رہے۔ انسان زندگی کی مختلف حالتوں میں بلندی کی طرف ابھرتا اور پستی میں گرتا رہتا ہے۔ کسی آدمی کے متقی یا فلاح یاب ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس نے غلطیاں نہیں کیں یا گناہ نہیں کیے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کے پاس میزان ہے۔ اس میزان میں بھلائی اور برائی کا ذرہ ذرہ تلتا رہتا ہے، کامیابی اور ناکامی کا مدار اس پر ہے کہ ان پلڑوں میں سے کونسا پلڑا بھاری رہتا ہے، اگر ننانوے برائیاں اور سو نیکیاں ہوں تو بحیثیت مجموعی خدا کے نزدیک یہ انسان نجات یافتہ ہے۔

حکیم ابی قورس فرقہ لذتیہ کے امام نے کہا کہ جب تک انسان پر سے دیوتاؤں کا خوف زائل نہ ہو، تب تک وہ اطمینانِ قلب حاصل نہیں کرسکتے۔ اس لیے اس نے لوگوں کو یقین دلانا شروع کیا کہ دیوتا انسانوں سے بغض اور حسد نہیں رکھتے وہ دنیا والوں کی زندگی سے بے تعلق اپنے آپ میں مگن ہیں، لہٰذا ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب بعض مذاہب نے دیوتاؤں کے وجود سے انکار کردیا اور ایک خدائے واحد پر ایمان لے آئے تو انھوں نے بھی خدا کے قہر کا ایسا بھیانک نقشہ کھینچا کہ لوگ دیوتاؤں سے چھوٹ کر ایک خدائے منتقم و قہار کے خوف سے کانپنے لگے، ایسی توحید نے بھی موحدوں کو خوف سے نجات نہ دلائی۔ لیکن قرآن کریم جب کبھی نجات یافتہ انسانوں اور حیاتِ طیبہ والے مومنوں کا ذکر کرتا ہے تو ان کی نفسی کیفیت یہی بیان کرتا ہے کہ لاخوف علیھم ولا ھم

یحزنون کہ ان پر کسی قسم کا خوف طاری نہ ہوگا اور نہ وہ حزن میں مبتلا ہوں گے۔ دینی اصطلاح میں جس کیفیت کو خوفِ خدا کہتے ہیں اس کا اصل مطلب گناہ اور اس کے نتائج سے بچنا ہے۔ بیماری کے خوف سے انسان صحت کا خیال رکھتا ہے۔ گندگی کے خوف سے انسان اپنے جسم اور کپڑوں کو بچاتا ہے، کسی محبوب کی ناراضگی کے خوف سے وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس سے محبت کا تعلق خراب ہو جائے صحیح معنوں میں خدا کا خوف بھی محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے نہیں کہ خدا سزا دینے کے لیے آمادہ بیٹھا ہے۔ گناہ خدا سے دوری کا نام ہے اور یہ دوری آپ ہی اپنی سزا ہے۔

بنیادی اسلام مستقبل میں تمام اقوام کا مذہب بننے کی صلاحیت رکھتا ہے

اس مختصر مقالے میں کئی بار دہرایا گیا ہے کہ اصل دین توحید ہے اور اس کے یقین اور عرفان کا نام ایمان ہے۔ محمدؐ رسول اللہ کی بعثت سے قبل بھی لاتعداد انبیا اور اولیاء اللہ توحید ہی کی تعلیم دیتے رہے لیکن تمام ادیان میں کسی نہ کسی طرح اس کی صورت مسخ ہوتی چلی گئی۔ شرک کی مختلف قسمیں اس کی جگہ لیتی گئیں۔ اسلام تمام انبیا کی تعلیم کو اسلام ہی کہتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر جس چیز کا نام اسلام ہے وہ پہلے پہل محمدؐ رسول اللہ کی تلقین کے ساتھ وجود میں نہیں آئی۔ نوحؑ اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسٰیؑ سب اسلام ہی کی تبلیغ کرتے رہے۔ شریعت اور منہاج میں تغیر و تبدل ہوتا گیا۔ لیکن اصل میں تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک تناور درخت جس کی جڑیں دور تک زمین کے اندر چلی گئی ہیں، اس کا تنا قائم رہتا ہے لیکن ہر سال اس میں کچھ شاخیں سوکھ جاتی ہیں اور کچھ شاخیں نکل آتی ہیں، ہر موسم خزاں میں پرانے پتے جھڑ جاتے ہیں، اور موسم بہار میں نئے پتے نکل آتے ہیں شرائع اور رسوم و شعائر یہی شاخیں اور پتے ہیں، جن کے بدلتے رہنے سے ہی حیاتِ شجر

میں تیزی اور تازگی برقرار رہتی ہے۔ رسول کریمؐ کی بعثت کے وقت ادیان کا یہ حال تھا کہ کہیں بھی توحید اصل اور خالص صورت میں نہ تھی۔ ہندو تہذیب و مذہب پر اسلام کے اثرات کی تحقیق میں ایک عالم ہندو مورخ ڈاکٹر تاراچند نے نہایت بے تعصبی سے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا۔ اس مقالے میں انھوں نے ثابت کیا کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد صدیوں تک جو مذہبی تحریکیں ہندو قوم میں پیدا ہوئیں، ان میں توحید کے جو عناصر پائے جاتے ہیں وہ اسلام ہی کے رہینِ منت ہیں۔ ہندوؤں نے وحدت وجود کا ایک فلسفیانہ تصور قائم کر لیا تھا جو فلاسفہ ہی کے کام کا تھا، عام سوسائٹی دیوتا پرست تھی۔ اوتار کا تصور بھی تھا، اور بعض مذہبی پیشوا عین خدا سمجھ کر پوجے جاتے تھے۔ اس طرح اس کٹر مذہبی قوم میں بھی خالص توحید کا تصور غائب ہو چکا تھا۔ توحید کے مسخ ہونے کے ساتھ قوموں کے اخلاق اور ان کے آئین بھی نہایت درجہ خراب ہو چکے تھے۔ عیسائیت کا بھی یہی حال تھا کہ ہندوؤں کی طرح عیسائیوں نے بھی اس برگزیدہ انسان کو خدا کا پاک نبی سمجھنے کی جگہ اس کو عین خدا بنا دیا تھا۔ توحید تقسیم ہو کر تثلیث بن گئی تھی اس کے ساتھ ہی توارثِ گناہ آدم جیسے فاسد عقائد پیدا ہو گئے تھے۔ دنیا کو ناپائدار اور ذلیل سمجھ کر اس کی طرف سے رخ پھیر لینا روحانیت کا مقصود بن گیا تھا۔ ایک طرف ہندوؤں نے دھرم شاستر مرتب کر رکھے تھے، جن میں ہر انسان کا مقام اور اس کے ہر عمل کی صورت معین کر دی تھی۔ آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل کا نام و نشان نہ تھا، رسوم و توہمات نے مکارمِ اخلاق کی جگہ لے لی تھی اور دین خاص مذہبی طبقوں کا اجارہ بن گیا تھا۔ توحید کی بجائے شرک اور اخلاق کی جگہ رسوم و روایات، مذہب و تہذیب کی یہی مسخ شدہ صورت ہر جگہ پائی جاتی تھی۔ بدھ مت میں فرار عن الحیات اور زندگی کے ہر افادی اور ایجابی پہلو سے گریز عرفان شمار ہوتا تھا، خدا اور دنیا اور عاقبت سب وہم و باطل تھے۔ یہودیوں نے اپنے خدا کو ایک قومی خدا بنا لیا تھا۔ یہ خدا دیگر اقوام سے اگر کچھ واسطہ رکھتا تھا تو وہ معاندانہ تھا۔ انبیا کی دی ہوئی شریعت میں اپنے توہمات اور شعائر کا بے شمار

اضافہ کر کے اس سب پلندے کو دین کہا جاتا تھا۔ یہاں بھی دین کی اجارہ داری تھی۔ دین کا باطن غائب ہو گیا اور کچھ مسخ شدہ بے جان ظاہر رہ گیا تھا۔ اس ظاہر سے سر مو تجاوز کفر کہلاتا تھا۔ مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی اس ظاہر پرستی کے خلاف شدید احتجاج کیا اور بتایا کہ خدا تنگ نظر منتقم نہیں ہے بلکہ سراپا محبت و رحم ہے۔ اخلاق تزکیہ باطن کا نام ہے، رسوم و شعائر اور قواعد کی ظاہری پابندی دین کی اصلی حقیقت نہیں ہے۔ ہر قوم نے اپنے تئیں خدا کی مخصوص قوم سمجھ لیا تھا۔ یہودی کہتے تھے کہ بہشت ان کے لیے مخصوص ہے، وہ جہنم میں نہیں ڈالے جائیں گے، جہنم کی آگ اگر ان کو چھوئے گی بھی تو چند روز تک۔ عیسائیوں نے توحید کو تثلیث اور روحانیت کو رہبانیت بنانے کے بعد یہودیوں کی طرح نجات کو اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ خدا تعالیٰ پر ایمان اور اعمال صالحہ نجات کے لیے کافی نہ تھے، ہر جگہ مذہب، صداقت اور نجات کی اجارہ داری بن کر رہ گیا تھا۔ ہر ایک اپنے مخصوص اور منتخب گروہ کے علاوہ تمام نوع انسان کو جہنم کا ایندھن سمجھتا تھا۔

اسلام نے نوع انسان پر جو احسان کیا وہ یہ تھا کہ مذہب کو ایک نہایت سادہ حقیقت کے طور پر پیش کیا اور بتایا کہ دین اتنا ہی ہے کہ انسان کو اس کا احساس ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق و ناظم ہے جو عاقل بھی ہے عادل بھی اور رحیم بھی۔ موجودات کا اگر عاقلانہ مطالعہ کیا جائے تو یہ یقین پیدا ہو سکتا ہے۔ تمام خلق عیال اللہ ہے۔ کوئی قوم خدا کی مخصوص قوم نجات کی اجارہ دار نہیں ہے۔ جو شخص خدا کی طرف رخ کر کے زندگی بسر کرے گا، اس میں خدا کے صفات کا عکس جھلکنے لگے گا۔ خدائے حکیم پر نظر جمائے رکھنے سے اس پر موجودات کی حکمت منکشف ہو گی، جس کو قرآن خیر کثیر کہتا ہے۔ اس کو جزو میں کل، قطرے میں دریا اور ذرے میں آفتاب دکھائی دے گا۔ اسی طرح خدا کے عدل اور رحمت پہ یقین رکھنے کی وجہ سے وہ خود بھی عادل اور رحیم بنتا جائے گا۔ خدا کے اسلامی تصور سے وہ صالح اور محسن بن جائے گا۔ اس طرح کا ایمان رکھنے والا زندگی کو مہمل نہیں سمجھے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ حیات بعد الموت کا بھی قائل

ہوگا۔ خدائے رب و رحیم جس کا کام پرورش کرنا اور مخلوق کی بقا اور صلاحیتوں کے لیے مواقع اور اسباب مہیا کرنا ہے، وہ انسانوں کو پیدا کرکے فنا نہیں کرتا جائے گا اگر فرد کی مرگ مرگِ دوام ہو اور جسمانی موت کے ساتھ اس کے نفس پر بھی فنائے مطلق طاری ہو جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ خدا نہ خالق ہے اور نہ رب اور نہ رحیم ہے۔ یہ تکوین اور سرآفرینش ایک فعلِ عبث ہو جائے گی۔ اخلاق کے اقدار اور نیکی کے نتائج اگر فانی اور آنی جانی ہیں تو اخلاقی احساس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ اسلامی توحید سے اخلاقِ فاضلہ اور بقائے روح منطقی نتائج کے طور پر اخذ ہو سکتے ہیں۔ سب کا خدا ایک ہے۔ اس لیے خدا کا قانون سب کے لیے مساوی ہے۔ اس میں اقوام اور ملل کی کوئی دو رعایت نہیں۔ فطرت کے طبیعی قوانین سب کے لیے مساوی ہیں اسی لیے روحانی اور اخلاقی قوانین بھی سب کے لیے برابر ہیں۔ اسلام میں حق اور فلاح و نجات کی صلائے عام ہے۔

خدا کی مغفرت اور جنت محدود نہیں کہ اس میں بس ایک چھوٹے سے گروہ کے لیے ہی جگہ ہو۔ اسلام کا خدا رب العالمین ہے، فقط رب المسلمین نہیں ہے، رب النصاریٰ نہیں، رب الیہود نہیں، اسی طرح اس کا رسول رحمۃ للعالمین ہے۔ خدا نے شعوب و قبائل اور ملل بنائے، ان کی تہذیبوں اور ان کے شعائر میں کم و بیش فرق ضرور رہے گا، جیسا کہ ان کی شکلوں، ان کے ماحول اور ان کی آب و ہوا میں فرق ہے، اس فرق کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں، لیکن بنیادی اخلاق میں انسانوں کو متفق ہونا چاہیے:

یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر و انثیٰ وجعلنٰکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ان اللہ علیم خبیر (الحجرات ۴۹۔ آیت ۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمھاری شاخیں اور قبیلے مقرر کیے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔

رسوم و رواج میں تم مختلف اطوار پر تو گے، لیکن سب کا رخ نیکیوں کی طرف رہنا چاہیے۔

اگر یہ بات موجود ہو تو ہر مذہب والے اور ہر قوم کو حیاتِ طیبہ اور نجاتِ اخروی حاصل ہو سکتی ہے۔ اصل چیز احسان اور اخلاق ہے۔ وسارعوا الیٰ مغفرۃ من ربکم وجنۃ عرضھا السمٰوٰت والارض اُعدّت للمتقین الذین ینفقون فی السرّاء والضراء والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس ط واللہ یحب المحسنین والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسھم ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبھم ومن یغفر الذنوب الا اللہ ولم یصروا علیٰ ما فعلوا وھم یعلمون۔

"اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑو جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے اور وہ ان پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو آسودگی اور تنگی دونوں میں خرچ کرتے ہیں، غصے کو دباتے ہیں اور لوگوں سے درگذر کرتے ہیں۔ اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان سے کوئی بے حیائی سرزد ہو جائے اور اپنے نفس پر ظلم کریں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ معاف کرنے والا کون ہے، اور جو برے کام کرتے ہیں اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔"

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ جو نظروہ انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ انسان کی فطرتِ صحیحہ میں سے پیدا ہو سکتی ہے۔ دینِ فطرت ہی تمام نوعِ انسان کا دین بن سکتا ہے۔ لیکن خدا کہتا ہے کہ تمام نوعِ انسان امتِ واحدہ نہیں بن سکتی، جس سے معلوم ہوا کہ امتیں یا ملتیں کم و بیش اختلافِ احوال اور تنوعِ اطوار کے ساتھ ہمیشہ باقی رہیں گی۔ جس طرح خدا نے اختلافِ الوان و السنہ کو اپنی آیات قرار دیا ہے، اسی طرح یہ اختلاف بھی ان آیات میں شمار ہو سکتا ہے کہ مختلف ملتوں میں عبادات اور شرائع گوناگوں ہوں، تمام نوعِ انسان از روئے فطرت اپنے تو اب جو اظہار میں یک رنگ نہیں ہو سکتی ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

رسول کریمؐ نے نہ صرف توحید کی تعلیم دی اور اس کو معقول اور فطری انداز میں پیش کیا بلکہ خاص شعائر پر ایک گروہ کی تنظیم بھی کی، اس میں ایک خاص قسم کا ڈسپلن قائم کیا۔ اس تمام ڈسپلن کا اصلی مقصد وہی ہے جو دین کا اصلی مقصد ہے یعنی توحید کے عقیدے اور اعمالِ صالحہ کو استوار کرنا۔ لیکن خدا نے دیکھا کہ موحد افراد دیگر ادیان میں بھی پائے جاتے ہیں، جن کا عقیدۂ توحید بھی درست ہے اور ان کے اعمال بھی صالح ہیں۔ بعض ایسے لوگ اپنی سوسائٹی کی روایات کی وجہ سے اس مخصوص جماعت میں داخل نہ ہو سکے، جو رسول کریمؐ نے تیار کی تھی۔ اسلام کی فراخدلی یہ ہے کہ ایسے افراد کے متعلق اس نے نہایت درجہ رواداری برتی ہے، ان کے ایمان اور ان کے اخلاق کی تعریف کی ہے۔ ان کو اسلام میں اسی طبقے میں داخل کیا ہے، جس نے خدا کی طرف اپنا رخ کر کے زندگی بسر کر دی اور وہ محسن تھے ایسوں کے لیے بھی قرآن میں وہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اولیاء اللہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ از روئے قرآن مومن و محسن افراد دو قسم کے ہو سکتے ہیں، ایک وہ جن کو محمدؐ رسول اللہ کی رسالت کو کما حقہٗ سمجھنے کا موقع ملا اور وہ نبی کی مقرر کردہ شریعت پر عامل ہوئے، دوسرا وہ طبقہ جو معاشرتی، روایاتی یا تاریخی مجبوری کی وجہ سے اس مخصوص ڈسپلن میں نہ آ سکا، لیکن وہ جہاں بھی رہا، موحد رہا اور اس کے اخلاق صالح رہے۔ اس نے اسلام کچھ اپنی فطرت اور کچھ اپنے عہد کے نبی کی نبوت سے حاصل کیا، وہ عبادت کرتا ہے لیکن اس کی عبادت میں مسلمانوں کی صلوٰۃ کے ارکان اور پابندیٔ اوقات نہیں، وہ مما رزقنٰھم ینفقون پر عمل پیرا ہے، غریبوں اور مسکینوں اور یتیموں کی بھلائی کے لیے اپنا مال، اپنا وقت، اور اپنی قوت بھی صرف کرتا ہے، لیکن اس کی خیرات مسلمانوں کی مقرر کردہ زکوٰۃ کے نصاب کے مطابق نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ زکوٰۃ مخصوصہ سے کہیں زیادہ خیرات کرتا ہو۔ وہ عہد کا پابند ہے، اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے، ایسا امین ہے کہ اگر اسے

کا ڈھیر اس کے پاس امانت رکھو اور تو اس میں ایک حبہ کی خیانت نہ کرے۔ کوئی نبی اپنے آپ کو منوانے نہیں آتا بلکہ خدا پر یقین اور اخلاق صالحہ کی تلقین کے لیے آتا ہے۔ اگر اس نبی کی امت اور جماعت کے باہر کچھ لوگ ایسے ملتے ہوں جن میں وہ باتیں موجود ہیں، جو اصل مقصود ہیں تو ایسوں پر نجات کا دروازہ بند کرنا حد درجے کی تنگ نظر ہوگی۔ یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں نے یہی تنگ نظر پیدا کرلی ہے وہ کسی ایسے شخص کو جو موحد اور صالح بھی ہو، مستحق نجات نہیں سمجھتے تھے، جو حرف بحرف ان کے تمام جزئی عقائد اور ان کی شرائع کا پابند نہ ہو۔ اسی تنگ نظری اور دین کی حقیقت سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے کفار نے رسول کریمؐ جیسے موحد اور امین کو بھی مستحق نجات نہ سمجھا۔ قرآن نے جا بجا دین میں اس تنگ نظری کی مذمت کی ہے۔ جن گروہوں سے اسلامی جماعت برسرپیکار رہتی ان کی بابت بھی قرآن نے یہ تلقین کی کہ ان میں سب افراد ایک ہی طرح کے نہیں ہیں، ان میں سے بھی تم کو بعض لوگ ایسے ملیں گے جو بڑے نیک اور خدا پرست ہیں۔ دین کی بابت یہ وسعت تعلیم قرآن میں جا بجا پھیلی ہوئی ہے اس کو ایک جگہ مختلف ملتوں کا نام لے کر وضاحت کے ساتھ یکجا کردیا ہے تاکہ دین کے متعلق اسلام کے نقطۂ نظر میں کوئی شبہ نہ رہے۔

ان الذین امنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون "وہ لوگ جو نبی کریمؐ کی خاص مومنین کی جماعت میں داخل ہوئے اور وہ لوگ جو یہود ہیں یا نصرانی ہیں یا صابی ہیں اگر ان میں یہ بنیادی باتیں پائی جائیں، کہ وہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے اعمال صالح ہیں، تو ان کی بھی نجات یقینی ہے۔ یہ بھی خدا کی مغفرت کے دائرے سے خارج نہیں ہیں، کیونکہ ایمان اور عمل صالح کی حقیقت ان میں موجود ہے۔

جن مسلمان علما نے اسلام کو اسی طرح تنگ کرنے کی کوشش کی ہے، جس طرح کہ دیگر ادیان نے اپنے آپ کو محدود و محصور کر لیا تھا، ان کو قرآن کریم کی ان آیات سے بہت پریشانی ہوتی ہے، اور وہ اپنی کھینچا تانی کی تاویلات سے قرآن کریم کی اس وسعت کو اپنے قلب کی تنگی میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان علما کا حال وہی یہود و ہنود والا حال ہے۔ خدا تو کھول کھول کر عطف کی واو لگا لگا کر کہتا ہے کہ جو ملتیں خاص مومنوں کی جماعت سے باہر ہیں، ان میں بھی اگر یہ اساسی باتیں پائی جائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بھی راہِ راست پر ہیں۔ لیکن علما نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ایک فاسق و فاجر جو مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہے وہ کمال درجے کے اخلاقِ صالحہ والے افراد سے جو غیر مسلم جماعتوں میں ہوں افضل و ارفع ہے۔ گنہگاری کے باوجود مسلمان کی نجات کی توقع ہو سکتی ہے لیکن غیر مسلم اعمالِ صالحہ کے باوجود بھی جہنم کا ایندھن ہے۔ یہود بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے اور اسی قسم کی اجارہ داری کے مدعی تھے۔ قرآن کو اس تنگ نظری کی جا بجا مذمت کرنی پڑی، لیکن شومئی قسمت سے قرآن خواں جماعت خود اسی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ ایک صاحب علم ڈاکٹر عبدالحکیم پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کا مرید تھا۔ لیکن جب راس کو مرزا صاحب کے دعاوی غلط معلوم ہوئے تو اس نے بیعت توڑ دی۔ مجھے اس جماعت کے ایک نہایت معتبر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب سے معلوم ہوا جو خود بھی اس جماعت سے نکل چکے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالحکیم کا جماعتِ احمدیہ سے جو اختلاف ہوا وہ اور امور کے علاوہ اسی آیت کی تفسیر کے متعلق تھا۔ وہ اس آیت کے صاف اور واضح معنوں کو صحیح سمجھتا تھا کہ بعض غیر مسلم بھی جن میں یہ بیان کردہ صفات پائے جائیں نجات یافتہ ہیں۔ احمدی جماعت کے علاوہ عام مسلمان علما بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ محض توحید اور اعمالِ صالحہ سے نجات نہیں ہو سکتی ہے۔ جدید مذہبی تحریکوں میں سے ایک تحریک کے امام نے جو بڑے اچھے مقالہ نویس ہیں اس آیت پر ایک مقالہ سپردِ قلم کیا ہے کہ اس آیت کے

معنوں میں لوگوں نے جو وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ دین کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، اور قرآن کریم پر سب سے بڑا بہتان ہے۔ افسوس ہے کہ اب مسلمان بھی اپنے مخصوص عقائد و شعائر و طریق عبادات کی بنا پر اسلام کو ایک فطری اور عالمگیر دین بنانے میں ویسی ہی رکاوٹ بن گئے ہیں جیسی کہ قبل اسلام کی تنگ نظر ملتیں تھیں۔ ان کے نزدیک نسلی مسلمان ہونا، یا مردم شماری کا مسلمان ہونا اور عقائد کے متعلق کچھ زبانی اقرار اور ظواہر شعائر و عبادات کی پابندی قلبی طور پر موحد اور عملاً صالح ہونے کے مقابلے میں افضل ہو گئی ہے۔

حال میں سویڈن سے ایک مشہور اخبار کا نمائندہ پاکستان میں فقط اس غرض سے آیا کہ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ اسلام کا نظریۂ حیات کیا ہے، اور اس نظریۂ حیات پر کس طرح ایک ترقی پسند اور مہذب و متمول مملکت کی بنا رکھی جا سکتی ہے۔ وہ مجھ سے بھی ملا اور کہا کہ میں موحد ہوں، اور دہریت کو غلط سمجھتا ہوں، مغرب کی مادیت، دہریت اور مادی اشتراکیت سے بیزار ہوں۔ میں نے اسلام کا نقطۂ نظر، علم و عمل اور جماعت و مملکت کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کو سن کر اس نے کہا ہم جیسے عیسائیوں اور تم جیسے مسلمانوں میں کیا فرق ہے، خدا کے بارے میں ہم ایک ہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور اعمال صالحہ کی بابت بھی ہم بہت کچھ متفق ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی تمام موحد جماعتیں یا افراد ایک متحدہ محاذ دہریت اور مادیت کے خلاف قائم کریں۔ ہم میں اور تم میں دین اور اخلاق کی بنیادی باتیں تو مشترک ہی ہیں۔ کیا ہم اس اشتراک عقائد کی بنا پر اشتراک عمل پیدا نہیں کر سکتے۔ میں نے اس کو جواب دیا کہ تم کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ اسلام نے تیرہ سو سال پیشتر یہی صلائے عام دنیا کے تمام موحدوں کو دی تھی کہ آؤ تم اور ہم توحید اور اعمال صالحہ کی بنا پر اشتراک عمل سے کام کریں۔ یہود اور نصاریٰ نے اس دعوت کو قبول نہ کیا، لیکن اسلام کی طرف سے یہ صلائے عام ہمیشہ کے لیے موجود ہے۔ اگر تم اس پر لبیک کہو تو یہ عین منشائے اسلام ہے۔

ہماری طرف سے پورا نعا دن ہوگا کیونکہ یہ اسلام ہی کی دعوت ہے ۔

ایک مسلمان مقالہ نگار نے تمام ایسے غیر مسلموں کو منافق قرار دیا ہے جو اسلام کے مداح ہیں ، اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ، لیکن اعلان کر کے مسلمانوں کی جماعت میں داخل نہیں ہوتے ۔ کارلائل نے تمام انبیا میں سے محمد رسول اللہ صلعم کو منتخب کر کے بطل نبوت قرار دیا ۔ لیکن مسلمان نہیں ہوا ۔ گبن نے اسلام کی تعریف کی اور مسیحیت کی مذمت کی لیکن مسلمان نہیں ہوا ۔ زمانہ حال میں برنارڈ شا نے اسلام کے متعلق کہا کہ مستقبل میں نوع انسان کا دین اور ادیان کے مقابلے میں اسلام سے زیادہ مشابہ ہوگا ۔ اتنا کہنے پر بھی اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہ کیا ۔ حال میں انگلستان کے مشہور مورخ ٹائن بی نے لکھا ہے کہ اسلام نے انسانیت کے ایسے اہم مسائل حل کیے ہیں جن کے حل کرنے میں عیسائیت اور مغربی تہذیب کو کامیابی نہ ہوئی ۔ اس کے باوجود بھی مسیح کا یہ نام لیوا ، اعلان کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل نہیں ہوا ۔ اس قسم کے سینکڑوں اہل مغرب ہیں جو اسلام کی حقانیت کے ازروئے تحقیق قائل ہو گئے ۔ ان میں سے بہت تھوڑے اپنے دین کو بدل کر اسلامی جماعت میں شامل ہوئے ۔ زیادہ تر اپنی ملت ہی میں داخل رہے ۔ لیکن اپنی ملت کو اسلام کی توحید اور اخلاق فاضلہ کی طرف توجہ دلاتے رہے ۔ یہ کس قدر تنگ دلی اور تنگ نظری ہے کہ ایسے بے تعصب لوگوں کو ریاکار کہا جائے ۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں یہودیت اور ہندویت کا عقیدہ جاری و ساری ہے ۔ مسلمانوں کی اپنی جماعتوں کی حالت ہر جگہ ابتر ہے ۔ نہ دین کے بارے میں ان کی بصیرت میں نور رہا ہے ، اور نہ وہ اپنی دنیا کو درست کر سکے ہیں ۔ اس کے باوجود یہ توقع رکھتے ہیں کہ دنیا کا ہر موحد و مصلح اعلان کر کے ان کی اس فرسودہ جماعت میں ضرور داخل ہو ، اور جب تک چند مخصوص ظواہر کا پابند نہ ہو جائے تب تک نہ اس کی نجات ہو سکتی ہے اور نہ کسی فاسق و فاجر ظاہری مسلمان پر اس کو ترجیح ہو سکتی ہے ۔

کلیات و جزئیات

حکمت کلیات کا نام ہے۔ حیات و کائنات میں اشیا و حوادث کی کثرت ہے۔ لیکن یہ کثرت ہر جگہ آئین و قانون میں منضبط اور منسلک ہے۔ حکمت کثرت کے اندر وحدت کا عرفان ہے یا جزئیات کے اندر ان کلیات کی تلاش ہے جو قانون ہونے کی وجہ سے غیر متغیر ہیں۔ اشیا اور حوادث میں ہر لحظہ تغیر ہوتا ہے۔ اشیا کے اندر کون و فساد ہے۔ وہ بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں کلیات تغیر پذیر نہیں ہوتے۔ جو علوم حکمت کی پیداوار ہیں وہ قومی، نسلی اور جغرافیائی تفریقات سے ماورائی ہیں۔ ریاضی سب اہل علم کے لیے مساوی ہے طبیعیات میں قومیت کو دخل نہیں، اس میں کسی قوم کا اجارہ نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت ایک قوم اور کسی وقت دوسری قوم تحقیقات میں دوسروں کے مقابلے میں پیش قدمی کرتی ہے۔ علوم و فنون نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نوع انسانی کو مسلمات پر متحد کر دیا ہے۔ اخلاقیات کے بنیادی اصول بھی تمام مہذب قوموں میں بہت کچھ مساوی ہیں۔ دین کا کام دنیا میں فساد کو مٹانا اور امن و آشتی کو ترقی دینا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دین ہی نے نوع انسان کو متخاصم گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے جان و مال و آبرو پہ ڈاکہ ڈالنا جائز سمجھتا ہے۔ اس وقت دنیا میں دو قوتیں طاغوتی کام کر رہی ہیں۔ ایک وطنی یا نسلی قومیت اور دوسرے مذہبی تعصب۔ وطن پرستی نوع انسان کی وحدت کی قائل نہیں۔ اسی طرح مذہبی تعصب بھی وحدتِ دین سے گریز کرتا ہے۔ اسلام مذہب کو حکمت اور فطرت قرار دیتا ہے، اور حکمت و فطرت میں کلیت اور ہمہ گیری ہوتی ہے۔ جب کوئی دین غیر فطری عقائد قائم کر کے اپنے گرد تعصب کا ایک حصار کھینچ لے تو اس دین میں عالمگیر ہونے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ دین کو حکمت کی طرح عالمگیر ہونا چاہیے اور وہ اسی صورت

ہیں ہو سکتا ہے کہ اس کی بنیاد ایسے کلیات پر ہو جو تمام موجودات پر حاوی ہیں اور تمام انسانوں پر اس کا مساوی اطلاق ہوتا ہے۔ جس طرح نیشنلزم کا علاج بین الاقوامیت اور وحدتِ انسانی کا احساس ہے، اسی طرح مذہبی تعصب کا علاج یہ ہے کہ مذاہب کے ان کلیات پر نوعِ انسان کو متحد کیا جائے جو عین فطرت ہونے کی وجہ سے سب کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ اتحاد کلیات ہی میں ہو سکتا ہے، جزئیات میں اتحاد ناممکن ہے۔ نوعِ انسان کے لیے یہ فطری بات ہے کہ ہر انسان کو غذا ملنی چاہیے لیکن تمام افراد اور تمام اقوام کے لیے ایک غذا تجویز نہیں ہو سکتی، ہر فرد اور ہر قوم اپنے مزاج اور اپنے ماحول کے مطابق اپنی غذا معین کر لیتا ہے اور حسبِ ضرورت اس میں تغیر و تبدل کرتا ہے۔ اسی طرح لباس کا حال ہے۔ تمام مہذب انسان کسی نہ کسی طرح کا لباس پہنتے ہیں لیکن ہر قوم کا لباس الگ الگ ہے جس کا تعلق کچھ آب و ہوا سے ہے اور کچھ قومی روایات سے۔ یہی حال زبان کا ہے انسان کا حیوانِ ناطق ہونا ایک فطری امر ہے، لیکن نوعِ انسان میں گروہ گروہ کی زبان الگ الگ ہے۔ قرآن کا زاویۂ نگاہ دین کے متعلق بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ دین کے کچھ کلیات ہیں جو تمام نوعِ انسان میں مشترک ہو سکتے ہیں۔ ان کلیات میں ایک عقیدۂ توحید ہے، اور دوسرا یہ عقیدہ کہ نیکی اور بدی کے اصول بنیادی طور پر یکساں ہیں۔ عقیدۂ توحید میں سب سے زیادہ کلیت ہے۔ تمام کائنات اس کی شہادت دیتی ہے۔ جن مذاہب میں توحید کی صورت بہت کچھ مسخ ہو چکی تھی، ان میں بھی رفتہ رفتہ توحید کا عقیدہ خالص ہوتا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں بہت سے موحد گروہ اور افراد پیدا ہو گئے ہیں، عیسائیوں میں بھی مسیح کو بعینہٖ خدا یا خدا کا بیٹا سمجھنے والے کم ہوتے جاتے ہیں۔ تاریخ فلسفہ کا مشہور مؤرخ ہائف ڈنگ لکھتا ہے کہ علومِ طبیعیہ میں جو کائنات کی وحدت اور آئین کی ہمہ گیری منکشف ہوئی ہے اس سے عقیدۂ توحید کو بہت تقویت پہنچی ہے۔ اسلام نے توحید اور اعمالِ صالحہ کو دین قرار دیا۔ اور ملتوں کے شعائر کو ایک ثانوی جگہ دی اور کہا کہ

اصل مقصد توحید کے راستے سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنا ہے۔ یہ دونوں عقیدے ایسے ہیں جو حکمت و فطرت کی بنا پر عالمگیر ہو سکتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی دین طریقِ عبادت اور متغیر قوانین کو عینِ دین سمجھے اور اصل و فروع میں فرق نہ کرے وہ دین عالمگیر ہونے کی صلاحیت کو کھو دیتا ہے اور نوعِ انسان کو متحد کرنے کی بجائے اس میں تفرقہ انگیزی کرتا ہے۔ ایسے دین میں ظاہر باطن پر اور فروع اصل پر غالب آجاتی ہے ایسے دین میں لوگ روایت پرست اور قدامت پرست ہو جاتے ہیں۔ وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنے تفصیلی آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی قومیں جامد ہونے کی وجہ سے زندگی کے ارتقا سے الگ ہو جاتی ہیں۔

مسلمان اس وقت جس چیز کو ازلی اور ابدی اسلام سمجھے ہوئے ہیں، اس میں کئی قسم کی چیزوں کی آمیزش ہے۔ اس میں اسلام کے ازلی اصول ہیں اور تغیر پذیر فروع بھی۔ قرآن کریم میں بھی کچھ وسیع اور بنیادی اصول ہیں جو ازلی اور ابدی دین ہیں، اور کچھ وقتی اور جزئی احکام ہیں۔ وقتی اور جزئی احکام میں نزولِ قرآن کے وقت بھی ردوبدل ہوتا رہا۔ صورتِ حال کے ساتھ ساتھ حکم میں بھی تبدیلی ہوئی۔ رسول کریمؐ نے اجتہادِ نبوی سے کام لیا، اس کے بعد اسلام کی اصلی روح کے مطابق خلفائے راشدین نے بھی کہیں توسیع کی اور کہیں تخفیف۔ جب تک اسلامی روح زندہ اور ترقی پذیر تھی اسلامی احکام نے کوئی جامد صورت اختیار نہ کی۔ قرآن کریم میں چور کے لیے قطعِ ید کا حکم تھا لیکن خود رسول کریمؐ اور خلفا نے ہر حالت میں چور کے ہاتھ نہیں کٹوائے۔ بعد میں فقہا نے اس کے ساتھ بہت سے شرائط وابستہ کیے کہ کس حالت میں چوری، ایسی چوری شمار ہو گی جس پر قطعِ ید ہو سکتا ہے اور کن حالتوں میں چوری ہونے کے باوجود قطعِ ید کی حد کا اطلاق نہ ہو گا۔ کئی احکام شرعی منصوصہ اور غیر منصوصہ تھے جن میں علت کے تغیر سے حکم کا اطلاق یا منسوخ ہو گیا، یا معلق کر دیا گیا۔ قرآن کریم کی ہر نص کے عقب میں ایک علت ہوتی ہے اس علت کا جاننا حکمت اور روحِ اسلام کا عرفان ہے۔ اگر کوئی مسلمان علت کو

جاسنے غیر نص کے الفاظ کو چمٹ جائے تو وہ خدا پرست ہونے کی بجائے الفاظ پرست ہو جائے گا اور رفتہ رفتہ روحِ اسلام سے بے گانہ ہو جائے گا ؎

حرم جویاں درے را می پرستند　　فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد　　کہ یاراں دیگرے را می پرستند

اس وقت مسلمانوں کے پاس فقہا اور علما کی مرتب کردہ فقہ کا ایک دفتر بے پایاں موجود ہے اور مسلمان اس دفتر کی پرستش کر رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ دفتر لال کتاب بن گیا ہے۔ انھوں نے خود زمانے کے حالات کا جائزہ لینا چھوڑ دیا ہے اور ہر مسئلے کا حل اس لال کتاب میں ڈھونڈتے ہیں۔ بیع و شرا، مالیات اور معاشیات کے تمام مسائل بدل چکے ہیں، اور ان کی ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں جو ہزار برس نہیں بلکہ دو سو برس قبل بھی کسی کے خواب میں نہ آسکتی تھیں۔ فقہ میں بہت سے اجتہادی قوانین اسلام کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً کاشتکاری کے متعلق جو کچھ احادیث میں ملتا ہے اس میں بے حد اختلاف ہے۔ لیکن جواز یا عدمِ جواز کی جو مختلف صورتیں ہیں، جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، وہ حجاز کے حالات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے بعد بہت سی فقہ عراق، شام اور مصر کے معاشی اور تمدنی حالات کو مدنظر رکھ کر مدوّن ہوئی۔ فقہائے کرام میں تفصیلی احکام کے متعلق کثرت سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن خاص گروہوں نے خاص خاص فقہا کی فقہ کو غیر متبدل شریعت قرار دے کر دین کا اٹل جزو بنا لیا۔ اور اپنے لیے اور آنے والی نسلوں کے لیے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا تھا کہ جو قوم جہاد یعنی زندگی کے ہر شعبے میں جدوجہد کرنا چھوڑ دے گی وہ مغلوب اور ذلیل ہو جائے گی۔ یہی بات اجتہاد کے متعلق بھی صحیح ہے۔ اجتہاد کو ترک کر دینے سے بھی قومیں جامد اور پس ماندہ ہو جاتی ہیں۔ فقہا نے اسلام اور احکامِ شریعت کی جو تعبیر کی وہ کہیں صحیح تھی اور کہیں غلط۔ وہ اپنے آپ کو معصوم عن الخطا نہیں سمجھتے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ ان

کے اجتہاد کو مذہب بنا لیں۔ جہاں حالات کے لحاظ سے ان کی تعبیر صحیح بھی تھی اور خاص ضرورت کو پورا کرتی تھی، وہاں بھی وہ جوں کی توں اب ہمارے لیے کار آمد نہیں کیونکہ ہماری دنیا ہی بدل گئی ہے۔ ہمارے مسائل کی صورت ہی ایسی ہے کہ ان کا حل کسی ہزار برس قبل کے فقیہ کے ہاں نہیں مل سکتا۔

تمام اہم مسائل میں ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں جو اس وقت موجود نہ تھیں اسلامی معاشیات کے کچھ بنیادی اصول ہیں جو قرآن کریم میں ملتے ہیں۔ وہ جزوِ دین ہیں اور روحِ اسلام کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن معاشیات کے جو قوانین ہماری فقہ کی قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کی اب حاجت ہی نہیں رہی۔ لونڈی اور غلاموں کے متعلق تمام فقہ قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ لیکن ہمارے لکیر کے فقیر ابھی تک اس کو پڑھتے اور پڑھاتے اور اس پر بحث مباحثہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ حفظانِ صحت کے جو قوانین فقہ قدیم میں ملتے ہیں یا جو بعض طبی باتیں اس میں درج ہیں، علوم کی ترقی نے ان میں بہت سی چیزوں کو باطل کر دیا ہے۔ مسلمانوں نے اس مدوّن فقہ کو شریعت قرار دے کر تغیر و اصلاح سے بالاتر کر دیا ہے۔ اس پورے مجموعے کو وہ غیر متبدل اسلام کہہ کر پیش کرتے ہیں، اور اس کے کسی جزو میں ذرا سی تبدیلی سے بھی انھیں ڈر لگتا ہے۔ گویا یہ دین سے انحراف اور کتاب الٰہی میں تحریف ہے۔ معاشی، سیاسی اور تمدنی معاملات میں تمام فقہ کی جدید تدوین کی ضرورت ہے۔ پرانی عمارت کو گرا کر اس کا ملبہ اور مسالہ بہت کچھ کام آ سکتا ہے۔ لیکن یہ تعمیر گویا کہ از سرِ نو بنانی پڑے گی۔ اس کی بنیادیں اسلام کے اساسی اصول ہوں گے لیکن اوپر اٹھنے والی تعمیر کا نقشہ پہلے نقشوں سے بہت کچھ مختلف ہوگا ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند   اوّل آں تعمیر را ویراں کنند

اسلام اسی حالت میں ایک زندۂ جاوید اور عالمگیر مذہب رہ سکتا ہے کہ اس میں اصول کو اوامر سے الگ کر کے دیکھا جائے۔

اسلامی شریعت کی بنیاد حکمت اور عدل پر رکھی گئی ہے اور حکمت و عدل اوامر کی لفظی اور ظاہری صورت پر مقدم اور مرجح ہوتے ہیں۔ اگر کسی ملت کا قانون ساکن اور منجمد ہو جائے، اور حالات کے تغیر کے ساتھ اس میں تغیر ممکن نہ ہو تو ایسی ملت ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی، اور زندہ و ارتقا پذیر قومیں اس پر غالب آجائیں گی۔ وہ خود اپنے آئین میں کوئی تغیر نہ کر سکنے کی وجہ سے زندہ قوموں سے مغلوب ہو جائے گی۔ مغلوب ہو کر ایسی قوم کو بجبر و اکراہ غالب قوم کے آئین کو قبول کرنا پڑے گا۔ جامد قوم جامد رہ نہ سکے گی۔ اس میں تغیر خارج سے پیدا کیا جائے گا۔ وہ حرکت کرے گی لیکن مجبوری اور معذوری کے ساتھ۔ چونکہ حرکت خود اس کے اندر سے پیدا نہیں ہوئی اس لیے اس میں کوئی عقلی اور روحانی نشو و نما نہ ہوگا، وہ ہر بات میں غالب اقوام کا پس خوردہ کھانے پر مجبور رہوگی۔ دین ہو یا دین کے ماتحت تشریع اس کا اصل مقصد انسانوں کی ربوبیت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ قانون نفع و ضرر کی بنا پر بنایا جاتا ہے۔ جس میں تجربتاً ثابت ہو کہ ضرر زیادہ ہے اور نفع کم، اس کو ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کوئی معمّا نہیں ہے۔ قرآن خود جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کی حکمت اور علت بیان کرتا ہے، اور وہ علت خاص حالات میں خاص طریقے سے انسانوں کی نفع رسانی پر مبنی ہوتی ہے۔ دین عدل اور رحمت ہے اور زندگی میں جائز آسانیاں پیدا کرنے کا نام ہے الدین یسرٌ۔ قرآن کی تعلیم ہے کہ خدا تمھارے لیے تنگیوں کو دور کر کے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر دفتر پارینہ کی ہر تفصیل کو دین سمجھنا شروع کر دیں، اور زبردستی اس کو وہاں لگانا شروع کر دیں جہاں اس کا اطلاق نہیں ہوتا اور جہاں اس کی علت موجود نہیں، تو یہ فعل عبث زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کی بجائے اس کے راستے میں روڑے اٹکائے گا۔

ایمان کیا ہے؟

انسان کی گوناگوں منطقی، غیر منطقی اور نفسیاتی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک عام تعریف جو منطق کی کتابوں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ نطق میں گویائی بھی داخل ہے اور عقل بھی۔ عام طور پر اس کے معنی عقل والا حیوان لیے جاتے ہیں لیکن انسان کی زندگی میں غیر عقلی عناصر اور محرکات اتنے کثیر اور شدید ہیں کہ اب جدید نفسیات اس کو حیوانِ عاقل کہنے سے گریز کرتی ہے، اور یہ تعلیم دے رہی ہے کہ انسان وہ حیوان ہے جو اپنی جبلّی خواہشوں اور غیر شعوری میلانات کو عقل و استدلال کا لباس پہنا کر اپنے افعال کو عاقلانہ ثابت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت کوئی اور حیوان نہیں کرتا۔ اس لیے یہ انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انسان کی اور بھی بہت سی امتیازی خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں جو اور حیوانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً یہ کہ انسان ہنسنے والا حیوان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان رونے والا حیوان ہے کیونکہ دوسرا کوئی حیوان نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے۔ انسان کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ آگے اور پیچھے دیکھنے والا جانور ہے۔ حافظہ انسان کے ماضی کو عالم شعور میں حال بنا دیتا ہے اور اس کے اکثر افکار و افعال کا رخ قریب یا بعید مستقبل کی طرف ہوتا ہے۔ زندگی اپنے

٭ یہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا آخری مضمون ہے جو انھوں نے وفات سے ایک ہفتہ قبل ثقافت کے لیے لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ اس کی دوسری قسط مکمل نہ ہو سکی۔ یہ مضمون لکھنے سے قبل انھوں نے کچھ عنوانات قلم بند کیے تھے جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مقالہ میں کیا کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ عنوانات کی یہ فہرست مضمون کے آخر میں درج کر دی گئی ہے۔

ادنیٰ مظاہر میں بھی یہاں تک کہ نباتی اور حشراتی دور میں بھی مقصد کوشی ہے۔ لیکن انسانیت کی سطح سے نیچے یہ مقصد غیر شعوری ہوتا ہے جیسا کہ درخت کی شاخیں نور و نارِ آفتاب کی جویا ہوکر یا بلند ہوتی ہیں یا اپنا رخ بدلتی ہیں۔ جانوروں کی حیرت انگیز اعجازانہ مقصد کوشی بھی زیادہ تر جبلّی اور غیر شعوری ہوتی ہے لیکن مستقبل کا کوئی تصوری نقشہ سامنے رکھ کر اس کی طرف کوشش کی باگوں کو موڑنا انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

انسان کی ایک اور بھی تعریف ہوسکتی ہے جو کہیں میری نظر سے نہیں گزری لیکن میرے ذہن میں اکثر گذری ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان "پرستش کرنے والا حیوان" ہے۔ کسی اور حیوان میں یہ جبلت دکھائی نہیں دیتی۔ وحشت کے ادنیٰ ترین ادوار سے لے کر تہذیب و تمدن کی حیرت انگیز بلندیوں تک ہم اسے کسی نہ کسی چیز یا مخلوق کی پوجا ہی کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ کبھی موجود کی پوجا کرتا ہے اور کبھی موہوم کو تصور میں موجود بنا کر پوجتا ہے۔ انسان اپنی تمام زندگی میں بیم و رجا کا شکار رہتا ہے۔ کبھی وہ طبیعی فطرت کے مظاہر سے خائف ہوکر ان کے شر سے بچنے کی کوشش میں ان کی پوجا کرتا ہے اور کبھی خواہشیں اور امیدیں اس کے لیے معبود تراشتی ہیں۔ اس سے کسی قدر ملتی جلتی انسان کی ایک یہ تعریف بھی ہوسکتی ہے کہ "انسان صاحبِ ایمان ہستی ہے"۔ انسان کی یہ تعریف بھی کہیں نظر سے نہیں گزری مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تعریف بھی اس کی اساسی فطرت کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ یہ خیال کسی قدر وضاحت طلب ہے۔

ایمان کا ایک صحیح اور سادہ مفہوم یہ ہے کہ کسی ایسی حقیقت کو سچ ماننا جو نہ صرف کسی فرد کے انفرادی تجربے سے متجاوز اور اس کے محسوسات سے ماورا ہو، بلکہ اجتماعی طور پر وہ حقیقت کسی کا حسی تجربہ نہ ہو۔ مختصراً یوں کہیے کہ ایمان کے مفہوم میں لازماً یہ امر داخل ہے کہ ایمان کسی قسم کا بھی ہو وہ ایمان بالغیب ہوتا ہے۔ انسان صرف آگے پیچھے دیکھنے والا حیوان ہی نہیں بلکہ ماورائے تجربہ حقائق کو تسلیم کرنے والا حیوان ہے۔ طرح طرح کے معبود بھی وہ اسی جذبۂ ایمانی کی وجہ سے تراشتا ہے اور طرح طرح کے مقاصد

وغایات ونصب العین بھی وہ اسی میلان کی بدولت بناتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ محض حاضر سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور کسی ایسی صورت حال کا آرزومند رہتا ہے جو ابھی پردۂ غیب اور کتم عدم میں ہے۔ لیکن یہ آرزو اس کو کبھی سہارا نہ دے سکے اگر اس کے متحقق ہونے کا یقین اس کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔ انسان ایسی آرزوؤں کے صورت پذیر ہونے پر بھی ایمان لاتا ہے جن کے پورا ہونے کے لیے کوئی اسباب موجودہ حالت میں دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن انسانی ارتقا کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اسباب ایمان پر مقدم نہ تھے بلکہ ایمان کے استقلال اور اس کی استواری نے اسباب مہیا کر دیے۔ اس لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایمان ایک تخلیقی قوت ہے۔

ہم نے انسان ہی کو صاحب ایمان ہستی کہا ہے لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ حیوانی زندگی میں بھی ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ارتقا ایمان ہی کی بدولت ہوا ہے۔ زندگی کبھی مادی اسباب و آلات سے پابزنجیر اور میکانکی علت ومعلول کے زنداں میں اسیر نہیں رہی۔ حیاتیات میں جن حکمانے ارتقا کا نظریہ پیش کیا ہے ان میں سے بعض اس کے قائل ہیں کہ حشرات وچرند وپرند میں بھی ارتقائے حیات نے جو انقلابی قدم اٹھائے ہیں ان کی وجہ بعض خارجی اسباب کا جمع ہونا یا ماحول کی فیاضی نہ تھی بلکہ اس امر پر غیر شعوری ایمان تھا کہ بلند تر زندگی ممکن الوجود ہے۔ اسلامی تاریخ میں ارتقائے حیات کے مبلغوں میں سب سے بڑھ کر عارفِ رومی ہیں۔ جنھوں نے وضاحت کے ساتھ یہ نظریہ پیش کیا کہ زندگی کسی مرحلے میں بھی قالب کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ روحِ حیات خود قالب آفریں ہے ؎

قالب از ما ہست شد نے ما ازو

بلند اور بہتر زندگی پر ایمان جانوں میں قوتِ خلاقی پیدا کرتا اور آرزوئے مستور کو سطحِ ظہور پر لاتا ہے۔ مادّے سے انسان تک جو قوت زندگی کو ابھارتی چلی آئی ہے اسے وہ عشق کہتے ہیں۔ یہی عشق وجدانِ حیات بھی ہے اور ایمانِ حیات بھی۔ مادّے کو حیاتِ نباتی کا کچھ تجربہ نہ تھا لیکن اس کا جذبۂ ارتقا ایمان آفریں تھا کہ بلند تر ہستی

سے رابطہ پیدا کرکے میں وہ کچھ ہو سکتا ہوں، جو ابھی میرے وہم و گمان میں نہیں آتا، لیکن ایسا ہونا یقینی ہے۔ مولانا روم نردبان حیات پر پایہ بہ پایہ چڑھتی ہوئی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ ایمان رکھتے ہیں کہ ؎

آنچہ اندر وہم نامد آں شوم

جس ہستی نے بھی حیاتِ حاضرہ کو اپنی منزل سمجھ لیا اور آئندہ کے ناقابل بیان ممکنات کو موجود بنانے پر یقین نہ کیا ایمان کی کمزوری کی وجہ سے اس کی ترقی رک گئی۔ عارفِ رومی نے کئی مرتبہ اس ایقان کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسان بھی ایک عبوری مخلوق ہے یا حیوانیت اور فوق الانسان کی طرف عبور کرنے کے لیے ایک پل ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہمیں تو یہ فوق الانسان نہ کہیں نظر آتا ہے اور نہ اس کا کوئی تصور ہمارے ذہن میں آسکتا ہے تو اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ موجودہ انسانی زندگی میں جو صورتِ حیات ابھی متحقق نہیں مجھے اس کی آرزو ہے اور اس کے متحقق ہونے پہ ایمان رکھتا ہوں:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

ازیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

مولانا نے کسی جگہ اس کی تشریح کی ہے کہ زندگی کی وسیع تر اور بلند تر سطح کا کوئی واضح تصور اس بلند تر سطح پر پہنچنے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال عارفِ رومی نے یہ دی ہے کہ رحم کے اندر، اگر جنین محض اپنے موجودہ تجربۂ حیات سے استدلال کرے تو اس کے لیے اس حقیقت کا قائل ہونا محال ہو کہ شکمِ مادر سے باہر ایک عظیم الشان عالم اور لامحدود گوناگونی کی دنیا ہے جس کے مقابلے میں میں موجودہ حالت میں ایک تنگ و تاریک زنداں میں مقید ہوں۔ نو مہینے اسی زنداں میں بسر کر چکنے کے بعد وہ کسی تجربے اور استدلال کی بدولت باہر نہیں آتا بلکہ زندگی کی وسعت کوشی کا ایک ایمانِ مضمر اس کو وسیع تر عالم میں لے آتا ہے جہاں پہنچ کر

تجربہ اس غیر شعوری ایمان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس سے مولانا یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ زمان و مکان کا عالم، یہ عالم رنگ و بو، یہ جہانِ آب و گل اپنی وسعتوں اور رنگینیوں اور دلآویزیوں کے باوجود ایک رحم ہے جس کے اندر انسانی جانیں پرورش پاتی ہیں۔ لیکن یہ ٹھہرنے کا مقام نہیں، سرائے سر راہگذار ہے، منزلِ مقصود نہیں۔ محض استدلال سے اس سے بالاتر عالم کا نہ ثبوت مل سکتا ہے اور نہ کوئی تصور حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن انسانی روح کے اندر یہ ایمان مضمر ہے کہ حیاتِ لامتناہی کو نہ زمان و مکان مقید کر سکتے ہیں اور نہ مظاہر کی علت و معلول کی زنجیریں۔ زمان و مکان کی ماہیت پر غور کرنے والا نفس خود اس زنداں میں محبوس نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے کہ اے معشرِ جن و انس تم ان حدود و قیود سے باہر نہیں نکل سکتے۔

یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم	یعنی گروہ جن وانس اگر تم میں یہ سکت ہے کہ
ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت	تم آسمانوں اور زمین کے حدود سے باہر نکل جاؤ
والارض فانفذوا لا تنفذون	تو یہ کوشش بھی کر دیکھو۔ تم کسی سلطان کے
الا بسلطان ۔	بغیر باہر جا ہی نہیں سکتے۔

یہ قوت یہ سلطانِ قید شکن وہی چیز ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ اسی سلطانِ ایمان کی بدولت قیودِ جمادی سے نکل کر حیاتِ نباتی میں داخل ہوتی ہے جہاں گل مبدل بہ گل ہوتی ہے۔ مٹی محض اپنی جمادی قوت سے کبھی گل نہ بن سکتی اگر مٹی محض مادی اسباب کے مہیا کرنے میں لگی رہتی اور اس کے اندر ممکن کو موجود کرنے کا ایمان اور میلان نہ ہوتا تو ابدالآباد تک جماد جماد ہی رہتا۔ اس جمود سے نکلنے والی قوت مٹی کا وہ ایمان ہے جس نے فقط موجودہ اسباب پر قناعت نہیں کی بلکہ بلند تر زندگی کے لیے اسباب و آلات و حالات پیدا کیے۔ اس نظریۂ حیات کے وہ حکما بھی قائل ہیں جنھوں نے زمانۂ حال میں انیسویں صدی کی گمراہ کن مادیت اور میکانیت کی تردید کر کے روحِ انسانی کے لیے آزادی کی راہیں کھولیں۔ اتفاقی طور پر وظائف اعضا کی تبدیلیوں

سے جگنو نے اپنا چراغ نہیں جلایا بلکہ تاریکیٔ شب میں راستہ ڈھونڈنے کی تمنا کی شدت نے یہ برقی بیٹری کرمکِ بے مایہ کے اندر پیدا کر دی۔ سمندر کی تاریکیوں میں بعض مچھلیاں خود اپنے نور کی روشنی میں اپنی زندگی کا کاروبار کرتی ہیں۔ علامہ اقبال انسان کو خودداری کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

تا کجا طور پہ دریوزہ گری مثلِ کلیم ‏ ‏ ‏ ‏ اپنی مٹی سے عیاں شعلۂ سینائی کر

یہ کام وہی ہے جو چمن کے جگنو اور سمندر کی بعض مچھلیاں انسان سے بہت پہلے کر چکی ہیں۔ اور اس اشرف المخلوقات کے لیے سبق آموز ہیں۔ اس خیال کو کہ زندگی حالات اور آلات کی محتاج نہیں بلکہ خود ان کی آفرینش کرتی ہے حکیم امت نے کس عمدگی سے اس شعر میں ادا کیا ہے:

کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت ‏ ‏ ‏ ‏ بلبل از ذوقِ نوا منقار یافت

بلبل کی منقار اور اس کے گلے کے ساز نے نغمہ آفرینی نہیں کی بلکہ شدتِ ذوقِ سرود نے یہ ساز مہیا کر دیا ہے۔ چکور کو ذوقِ رقص نے موزوں قسم کے پاؤں عطا کیے ہیں یہ نہیں ہے کہ پاؤں کی خاص ساخت کی وجہ سے وہ رقص کرنے لگا ہے۔ اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کی قوت ہی زندگی کی تخلیقی قوت ہے۔ جمادات سے لے کر انسان تک اس کا ایک ہی قانون ہے اگرچہ اس قانون کے اطلاق میں تنوع اور مسلسل بڑھتی ہوئی وسعتیں اور بلندیاں پائی جاتی ہیں۔

ایمان کی ماہیت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اس حقیقت کا ایقان ہے جو عالمِ شہادت کے مقابلے میں ابھی تک عالمِ غیب میں ہے۔ اس کی ضد کفر ہے جس کا مفہوم عالمِ غیب کا انکار ہے۔ قرآن کریم میں آدم و ابلیس کا قصہ در حقیقت ایمان و کفر کی تفریق کی وضاحت ہے۔ خدا نے آدم کو مٹی سے بنایا۔ ابتدا سے آج تک جتنے انسان ہیں وہ سب مٹی ہی کے بنے ہوئے ہیں۔ گوشت، پوست، ہڈی، خون سب مٹی ہی کے عناصر کی مختلف صورتیں ہیں۔ تمام غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ مٹی نبات بنتی ہے اور نبات کو حیوانات بدن کے اجزا میں تبدیل کرتے ہیں انسان

جب سبزی کھاتا ہے یا گوشت کھاتا ہے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ خاک کا پتلا خاک ہی کھا رہا ہے۔ اس مٹی کے بت کے اندر خلاقِ فطرت نے اپنی روحِ حیات پھونک دی نفخت فیہ من روحی جس کی بدولت لامتناہی زندگی کے ممکنات اور لامحدود قوتیں اس کے اندر مضمر ہو گئیں، جس طرح کہ ایک ثمر آور درخت اپنے چھوٹے سے بیج میں مضمر ہوتا ہے۔ ملائکہ ملکاتِ حیات کی مختلف صورتوں کا نام ہے۔ ملک اور ملکہ کا لفظی مادّہ ایک ہی ہے۔ عارفِ رومی نے اپنے ملفوظات "فیہ ما فیہ" میں ملائکہ کو اس عقلِ کل کی متنوع صورتیں قرار دیا ہے جن کی بدولت حیات و کائنات کا نظم و نسق قائم ہے۔ اس کی مثال انھوں نے یہ دی ہے کہ موم سے کئی طرح کے پرندے بنا سکتے ہیں لیکن اگر ان سب کو پگھلا دیا جائے تو محض موم کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ ان کی صورتیں محض اعراض تھے جن کا جوہر فقط موم تھا۔ قصۂ آدم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ملائکہ کو حکم ہوا کہ تم اس نو آفریدہ مخلوق کے آگے سرِ تسلیم خم کرو۔ خدا کے مطیع تو تم ہو ہی لیکن اب بحکمِ خدا اس کی بھی اطاعت کرو جس میں روحِ الٰہی پھونکی گئی ہے۔ اس مخلوق کی تقدیر یہ ہے کہ وہ اس عالمِ ارضی میں نائبِ حق ہو۔ نائبِ حق کی اطاعت حق کی اطاعت کے منافی نہیں بلکہ بحکمِ حق لازم ہے۔ آدم کو ذی اختیار ہستی بنانے کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس اختیار کا غلط استعمال کرے اور اسے تعمیرِ حیات کی بجائے تخریب میں صرف کرنے لگے۔ ملائکہ یا فطرت کی قوتوں کو انسان کا یہ پہلو دکھائی دیا کہ یہ فساد پیدا کرے گا اور خون ریزی کرے گا اور اس حالت میں بندۂ فرماں بردار نہ ہو گا۔ انسان کی فطرت کا یہ پہلو بھی ایک حقیقت ہے اس لیے ملائکہ کو جو کچھ اس کے اندر نظر آیا وہ بھی صحیح تھا مگر غلطی اس کے اندر یہ تھی کہ

عیبِ او جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

آدم کے علم و ہنر کے پہلو فطرتِ مجبور کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ آفرینشِ آدم کے بلیغ اشعار میں علامہ اقبال نے اس خیال کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے:

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور　　خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

وردودِ آدم سے قبل کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہ تھی جسے اپنے آپ کو بنانے اور بگاڑنے کا اختیار ہو۔ بالفاظ دیگر وہ ایک حد تک اپنی تقدیر کی معمار ہو۔ کسی مخلوق میں اپنی ذات کا شعور بھی نہ تھا۔ حسب ضرورت شعورِ ماحول جانداروں میں پایا جاتا تھا لیکن اس سے آگے نہ شعورِ ذات تھا اور نہ شعورِ حق۔ ابتدائی آشفتگی کے بعد فطرت کی قوتوں نے اطاعتِ آدم اس لیے قبول کر لی کہ علمِ اشیاء و حوادث کی بدولت اس کا مسخّر کائنات ہونا ان پر آشکار ہو گیا۔ تسخیرِ فطرت انسان کا مخصوص وظیفہ حیات اور درجۂ تکریمِ آدم ہے۔

فطرت کی قوتیں اس کی عظمت پر ایمان لے آئیں لیکن ابلیس کافر ہو گیا۔ اس کفر کی ماہیت بھی قرآن کے قصۂ آدم سے آشکار ہوتی ہے۔ اس قصے میں ابلیس اس مادّیت کا نمائندہ ہے جس کو مادّے کی ترکیبات کے اندر مادی عناصر سے زیادہ کوئی مستقل جوہرِ حیات نظر نہیں آتا۔ قرآن کا ابلیس مظاہر پرست ہے۔ اس نے آدم کو فقط اسی نظر سے دیکھا کہ وہ محض مٹی کا ایک پتلا ہے۔ اس بے حقیقت مخلوق کو مسجودِ ملائک ہونے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا۔ آج بھی جو حکیم طبیعی مادّیت اور میکانیت کے باطل فلسفے کا شکار ہے وہ انسان کو عناصر ارضی کا ایک اتفاقی مجموعہ و مرکب سمجھتا ہے۔ وہ اس کے اندر حیاتِ حیوانی کے علاوہ کسی ایسی روح کا قائل نہیں جو مادی قوتوں کی پیداوار نہیں بلکہ علم و عمل کی بدولت مسخّر اور نفخۂ الٰہی کی بدولت لامتناہی قوتوں کی حامل ہے۔ وہ روح کی آواز کو جسم کے ساز کی آواز سمجھتا ہے۔ جو ساز کے ٹوٹنے پر خاموش ہو جائے گی۔ یا چراغ بدن کے تیل کی عارضی روشنی ہے جو چراغ کے ٹوٹنے یا تیل کے ختم ہونے پر ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی۔ گویا بندر کی ایک ترقی یافتہ نوع ہے جس نے بندروں سے زیادہ ذہین ہو کر بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے آلات بنا لیے ہیں۔ مادہ پرست کو اس کے اندر کوئی ابد قرار حیات نظر نہیں آتی۔ اکبر الٰہ آبادی نے باندازِ ظرافت کیا حکیمانہ بات

کہی ہے:

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈاروِن بولے بوزنہ ہوں میں
سن کے کہنے لگے مرے اک دوست فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

قرآن نے مظاہر پرستی اور مادہ پرستی ہی کو باندازِ ابلیس پیش کیا ہے جس کو تکریمِ آدم کے وجوہ نظر نہیں آسکتے۔ اس کا استدلال مادہ پرستی کے اندر محصور ہے اس لیے کہ آدم بس خاک کا پتلا ہے۔ آدم کا مرئی مظہر یقیناً خاکی تھا۔ اس کے لامتناہی امکانات پر یقین ایمان کا متقاضی تھا جو ابلیس میں پیدا نہ ہوسکا۔ اس کے معلومات سب ادراکاتِ حاضر کی بدولت تھے۔ حاضر سے غیب کی حقیقتوں کی طرف عبور کرنے کی صلاحیت اس میں نہ تھی۔ جس کو مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایمان سے عاری تھا۔ ابلیس ایک تمثیل ہے اس محصور و محدود نظر والے انسان کی جو زندگی کی لامتناہی سریت اور اس کی لامحدود ارتقائی قوتوں کا قائل نہیں۔ مادہ پرستی حاضر پرستی ہے۔ وہ اس امر کا انکار ہے کہ ہر حالت میں غیب حاضر کے مقابلے میں وسیع تر ہے۔ مزید براں انفس و آفاق دونوں میں غیب حاضر کے مقابلے میں کشافِ حقیقت بھی ہے اور بواسطۂ ایمان خلاقِ حیات بھی۔

قصۂ ابلیس و آدم میں اور بھی نہایت اہم اسرارِ حیات پنہاں ہیں۔ فقط مادیت کا قائل اور مظاہر پرست ان تمام حقائق کی نسبت مائل بہ انکار ہوتا ہے جو اس کے ادراکِ حسی کے محدود سانچوں میں نہ ڈھل سکیں۔ طبیعی سائنس کی ترقی نے حیات و کائنات کا جو غلط نظریہ وضع کر دیا وہ خود انسان کے نفسی حقائق کا بھی منکر ہوگیا۔ کیونکہ نفس کی کوئی مستقل حقیقت مادی مظاہر کی علت و معلول کی کڑیوں میں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ مادیت کا مدار ریاضیات پر تھا۔ اس نظریے کے مطابق ہر شے کی حقیقت ریاضیاتی تناسب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس چیز پر ریاضی کا اطلاق نہ ہوسکے وہ محض وہم کی پیداوار ہے۔ مادیت کی

بنا پر جو نفسیات لکھی گئی اس نے روح یا نفس کو خارج از بحث کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود وہ شعور بھی بے حقیقت ہو گیا جس نے یہ نظریہ حقیقت پیدا کیا تھا گویا اس خیالِ باطل کی بنا پر انسان خود اپنا منکر ہو گیا۔ مادی مظاہر کے تسلسل کا اقرار باقی رہ گیا اور اس کے علاوہ تمام حقائقِ حیات کے متعلق انکار ہی انکار۔ اس انکار منشی سے ایک جھوٹا پندار پیدا ہوا۔ مادّہ پرستی میں عالمِ کل ہونے کے زعم نے ترقی پذیر معرفت کے دروازے بند کر دیے۔ قرآن کریم کے ابلیس میں اسی لیے آپ کو انکار اور پندار نظر آتا ہے۔ حقائق نامشہود کا انکار انسان کے نفس کو محدود کر دیتا ہے۔ معرفت حیات کے لیے لازمی ہے کہ انسان حقیقتِ حیات کی لامحدودیت کا احساس رکھے۔ جو کچھ اب تک معلوم ہوا ہے اس کو نامعلوم کے مقابلے میں نہایت قلیل سمجھے۔ اور رب زدنی علما کی مسلسل دعا اس کا وظیفہ بن جائے۔ علم کے ساتھ حلم اسی زاویۂ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے افلاطون نے کہا کہ علم کی ابتدا حیرت سے ہوتی ہے۔ حیرت انسان کے اندر استفہام پیدا کرتی ہے اور پیدا شدہ سوال کے جواب کے لیے نفسِ انسانی تجسس، مشاہدے اور استدلال سے کام لیتا ہے۔ زندگی کی نسبت جس شخص کے اندر حیرت پیدا نہیں ہوتی اس کے اندر حکمت کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ حکمتِ یونانی نے حیرت کی بدولت علم میں ترقی کے بہت سے قدم اٹھائے۔ لیکن وہ علم میں اس فراوانی پر نہ پہنچے جو انسان کو پھر ایک نئی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اس نئی حیرت ہی سے نئی معرفت کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ عرفی نے اس مضمون کو نہایت بلیغ انداز میں ادا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عوام جن باتوں کو معلوم اور واضح سمجھتے ہیں، گویا ان کو جاننے میں کوئی اشکال ہی نہیں ان کے پردے میں پُراسرار حقائق ہیں جن کا اندازہ چشمِ بصیرت یا عارفانہ حیرت ہی کر سکتی ہے؛

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

اسی مضمون کو مرزا غالب نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے:

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ عارفانہ حیرت "ایمان بالغیب" کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ احساس حیرت، حیات، احساس وسعت عالم غیب کا نام ہے۔ ہمارے ہاں حکیمانہ مزاج کے صوفیائے کبار نے عارفانہ حیرت ہی کو علم کا انجام قرار دیا ہے۔ عارفِ رومی کہتے ہیں:

علم را بفروش و حیرانی بخر

کیونکہ محض علم سے پندار پیدا ہوتا ہے اور حیرت سے نظر میں وسعت و اضافہ ہوتا ہے۔ عطار کا یہ قطعہ بھی نہایت درجہ عارفانہ اور حکیمانہ ہے:

کاملے گفت است می باید بسے — عقل و حکمت، تا شود گویا کسے

بار باید عقل بے حد و شمار — تا شود خاموش یک حکمت شعار

مگر یہ خاموشی پھر آبستن حقائق ہو جاتی ہے اور اس سے ایک نئی سطح کی گویائی نمودار ہوتی ہے جس کے اندر عجز بھی ہوتا ہے اور اقرار بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انکار و پندار ناپید ہو جاتے ہیں اور "ایمان بالغیب" سے معرفت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کسی انسان کے اندر یہ خیال کہ میں عرفانِ حقیقت کے منتہےٰ پر پہنچ گیا ہوں، اس پر مزید ترقی کے راستے بند کر دیتا ہے اسی لیے عارفِ رومی یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ ہستی لامتناہی ہے کسی ایک مقام کو آخری منزل سمجھ کر اس پر ڈیرہ نہ ڈال دینا:

اے برادر بے نہایت در گہیست — ہر چہ بروے می رسی بروے مایست

معرفت کوش انسان میں کبھی انکار، پندار اور استکبار پیدا نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے انھیں صفاتِ حیات کُش کو ابلیسیت قرار دیا ہے۔ روحیت اور الوہیت کو حیات و کائنات کی اساس سمجھنے والا ایک قسم کی لاادریت کے باوجود معرفت میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ عقل و ادراک اور انسانی تجربات سے حاصل شدہ معلومات کو وہ کبھی حقیقتِ کلی کا مرادف نہیں سمجھتا۔ ایک عظیم الشان نبی بھی جس پر معرفت کے کئی

دروازے کھولے گئے وہ بھی علی الاعلان اقرار کرتا ہے کہ ماعرفنا حق معرفتک علم ہستی ہی کا ہوتا ہے۔ اگر ہستی لامتناہی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ انسان کا علم کسی ایک منزل پر بھی پوری ہستی پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے ایک طرف ہستی کے لامحدود ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور دوسری طرف علم کے محدود ہونے کا احساس بھی انسان کو دلایا ہے۔ کلماتِ الٰہی جن سے آفرینش و بقائے حیات و کائنات ہے ان کے لامحدود ہونے کی نسبت فرمایا گیا کہ اگر تمام سمندر لکھنے کی روشنائی بن جائیں اور تمام جہان کے درختوں سے قلم بنائے جائیں تو بھی ان کلمات کی مکمل فہرست نہ بن سکے:

ولو ان ما فی الارض من شجرۃ اقلام والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر ما نفدت کلمٰت اللہ۔ (۳۱ : ۲۷)	اور اگر زمین کے سارے درخت قلم بن جائیں اور سمندر بلکہ اس کے علاوہ سات سمندر اور بھی سیاہی بن جائیں تب بھی "کلمات اللہ" ختم نہ ہوں گے۔

اور علم کی نسبت فرمایا کہ:

وما اوتیتم من العلم الا قلیلا	تمھیں بہت کم علم دیا گیا ہے

خدا اپنے فیض سے غیب کے حقائق حسبِ سعی و توفیق اور حسبِ ضرورت اپنے خاص بندوں پر منکشف کرتا رہتا ہے لیکن یہ انکشاف بھی جزئی ہوتا ہے اس لیے کوئی عارف باللہ یا نبی محترم مطلقاً عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بہت کچھ جو عوام کے لیے غیب ہوتا ہے خواص کے لیے شہود اور تجربہ بن جاتا ہے لیکن خواص کے آگے ہمیشہ بہت کچھ غیب باقی رہتا ہے اس لیے ایمان بالغیب کی ضرورت وہاں بھی ہے۔

مادیت پرست اور ظاہر پرست جبری بھی ہوتا ہے اس کو طبیعی مظاہر میں ہر جگہ جبر ہی جبر دکھائی دیتا ہے۔ مادی مظاہر کی فطرت، فطرتِ مجبور ہے۔ سیارے

اپنے مداروں میں ریاضیاتی جبر کے ماتحت گردش کرتے ہیں۔ ہوائیں اپنی مرضی سے اپنا رخ نہیں بدل سکتیں۔ پانی اپنی مرضی سے نشیب کی بجائے فراز کی طرف نہیں بہہ سکتا۔ مادی مظاہر کی تقدیر متعین اور اٹل ہے۔ عقل مظاہرِ فطرت سے قوانین اخذ کرتی ہے وہ بھی اس جبری فطرت کی آئینہ دار ہے اسی لیے از روئے عقل اگر اختیار کو ثابت کرنا چاہیں تو یہ کوشش کبھی بارآور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عقل کا وظیفہ ہی یہی ہے کہ وہ ایک طرف مظاہرِ فطرت ہیں اور دوسری طرف استدلال میں لزوم کی کڑیاں تلاش کرے۔ جن لوگوں نے دین کے اندر بھی محض عقلِ استدلالی سے کام لیا ہے وہ خدا کے عطا کردہ اختیارِ انسانی کو ثابت نہیں کر سکے اور ہمیشہ کسی نہ کسی رنگ میں جبر ہی پر پہنچے ہیں۔ چنانچہ متکلمین میں اشاعرہ اسی لیے جبری ہو گئے۔ انھوں نے عقیدۂ کسب کے پردے میں جبر کو چھپانا چاہا لیکن جبر چھپ نہ سکا۔ صحیح عقیدہ وہی مسلّمہ اسلامی عقیدہ تھا کہ الایمان بین الجبر والاختیار انسان طبیعی فطرت سے مطلقاً الگ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کے باہر اور اس کے اندر بھی جبر کے بہت سے مظاہر موجود ہیں لیکن انسان کی امتیازی خصوصیت خدا کا عطا کردہ اختیار ہے جو طبیعی فطرت کی علت و معلول کی کڑیوں سے الگ چیز ہے۔ یہ احساسِ اختیار انسان کے وجدانِ حیات میں داخل ہے۔ اگر مظاہرِ فطرت اور مظاہر شناس حکمتِ طبیعی اس کے اقرار کے لیے دلائل مہیا نہیں کر سکتے تو اس سے اختیار باطل نہیں ہو جاتا کیونکہ زندگی مظاہرِ فطرت اور منطق سے وسیع تر اور عمیق تر ہے۔ زندگی کا یہی باطنی وجدانِ فطرت اور عقلِ مظاہر شناس کے مقابلے میں عالمِ غیب میں ہے۔ جو کچھ عالمِ شہود میں آجائے گا وہ جبر اور منطق و ریاضیات کی کڑیوں میں پرو دیا جائے گا۔ اسی وجہ سے مادیت والے تمام فلاسفہ جبری ہیں مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ بعض منطق بگھارنے والے حامیانِ دین بھی جبر ہی کی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں۔ علم الکلام کے علاوہ اس تعلیم کا اثر ہمارے بھٹکے ہوئے تصوف پر بھی پڑا اور تصوف کے راستے سے

ہماری شاعری میں بھی دخیل ہو گیا:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا (میرؔ)

جہازِ عمرِ رواں پہ سوار بیٹھے ہیں!
سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں (آزادؔ)

فارسی متصوفانہ شاعری بھی اس خیالِ باطل سے لبریز ہے۔ اسلامی تعلیم اور شاعری میں اس کے خلاف شدید جہاد پہلے عارفِ رومی نے اپنی مثنوی میں کیا اور زمانۂ حال میں علامہ اقبال نے بھی نہایت زور سے جبر کے خلاف احتجاج کیا۔ قصّۂ ابلیس و آدم میں ہم دیکھتے ہیں کہ آدم نے تو اپنی لغزش کا اقرار کیا کہ میں معافی کا خواستگار ہوں میں نے اپنے اختیار کو غلط برتا۔ لیکن مادّیت اور اس سے وابستہ عقلیت کے مظہر ابلیس نے خلاف ورزیٔ حکمِ الٰہی کا الزام خود خدا پر دھرا اور کہا کہ اگر میں گمراہ ہوا ہوں تو قادرِ مطلق ہونے کی وجہ سے تو نے ہی مجھے گمراہ کیا۔ آدم اختیار کا اقرار کرتے ہوئے معافی مانگتا ہے لیکن ابلیس اپنی مادّیت کی وجہ سے جبر کی پناہ لیتا ہے۔

فہرست عنوانات

ایمان یقین بے دلیل کا نام ہے۔

ہر ایمان، ایمان بالغیب ہے۔ جو کچھ ابھی تجربے میں یا معرضِ شہود میں نہیں آیا اس کی حقیقت کا یقین۔ امید کا طبعی میلان جو انسان میں موجود ہے اس کا نام ایمان ہے۔ دنیا بہ امید قائم عام محاورہ ہے، اور ایمان آخرت بہ امید قائم۔

محض ممکنات کی نسبت احتمالِ ضعیف یا احتمال قوی ہو سکتا ہے مگر اس کو ظنی فلسفہ کہہ سکتے ہیں ایمان نہیں کہہ سکتے۔

محض نقل یا سند کی بنا پر کچھ یقین کر لینے کا نام ایمان نہیں۔ رسولِ کریمؐ سے

بھی محض دوسرے انبیا کو سند قرار دے کر ایمان حاصل نہیں کیا۔ بعض اکابر انبیا کی تعلیم — وہ قبل وحی قرآن بھی آگاہ تھے۔ مگر اس دور کی نسبت قرآن کہتا ہے کہ تم کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔

جب کسی مذہب کی بنا پر محض نقل و سند کے سوا کچھ نہیں رہتی تو وہ مذہب کمزور اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ روحانیات میں تقلید کو مولانا روم نے بہت بودا عمل قرار دیا ہے۔

ایمان اور عشق کا باہمی واسطہ۔ عشق کے اندر جو شدید تمنا ہے کیا وہ ایمان آفرین ہوتی ہے؟

زمان و مکان میں محدود حاضر کو کل حقیقت سمجھ کر اس پر فتویٰ نہ لگانا بلکہ اس کو ایک وسیع تر کل کا جزو سمجھ کر کوئی رائے قائم کرنا۔

عقل، ارادہ اور جذبات، نفس انسانی کے تینوں عناصر ایمان میں یک جا پائے جاتے ہیں۔ ایمان کا تعلق انسانی تجربے سے ہے۔

صبر ایمان کا لازمی جزو ہے۔ تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

ایمان عقل کا پر پرواز ہے۔ عقل محسوسات و معقولات سے رشتہ بہ پا، پا بہ زنجیر زمین پیمائی کرتی اور دھیرے دھیرے پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے

ایمان پر عمل کرنے کے لیے عقل درکار ہے۔ لیکن عقل کی قوتیں بغیر ایمان کے نہ محرک عمل ہو سکتی ہیں اور نہ جذبہ آفریں۔ اصلها ثابت وفرعها في السماء

ایمان انبیائے عظام و اولیائے کرام میں جبلی اور وہبی ہوتا ہے یا شدید تلاش حق اور کارزار نفس کے بعد یہ فیضان حاصل ہوتا ہے۔

تاریخ انسانی میں تمام بڑے کارنامے کسی نہ کسی قسم کے ایمان کی بدولت ظہور میں آئے ہیں۔ ایمان کی قوت ہی نے ناپید کو پیدا اور مستور کو ظہور بخشا ہے۔

ایمان زندگی کی تخلیقی قوتوں کا نام ہے۔ تخلیق بھی اسی کی بدولت ہے اور بقا کا ضامن بھی یہی ہے۔

کسی چیز پر جتنا ایمان ہوتا ہے اسی نسبت سے انسان اس کے حصول و بقا میں قوتیں صرف کرتا ہے۔ اگر کسی معاملے میں انسان کا عمل مذبذب اور بودا ہے تو یہ قطعی ثبوت اس امر کا ہے کہ اس کی تہہ میں جو ایمان ہے وہ استوار نہیں

انسان زندگی کا راستہ ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ ایمان کی آنکھوں سے طے کرتا ہے۔ اگر ایمان غلط ہے تو انسان غلط راہوں پر گامزن ہو کر فلاحِ حقیقی کو کھو بیٹھے گا۔

غلط ایمان کے ساتھ صراطِ مستقیم پر چلنا محال ہے۔

ایمان ایک مرتبہ حاصل ہو کر خود بخود قائم رہ سکتا ہے یا جسم کی طرح اس کو بھی اپنی بقا کے لیے مسلسل غذا کی ضرورت ہے؟

عمل کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے۔ اگر ایمان درست ہے تو عمل کے نتائج اس کو تقویت بخشتے ہیں اس لیے یہ کہہ سکتے ہیں ایمان سے عمل اور عمل سے ایمان پیدا ہوتا ہے۔

مصائبِ حیات کے حملوں میں ایمان ڈھال کا کام دیتا ہے۔ (حدیث)

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا ایمان اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری اور اس کے تمام محسوسات و تجربات پر حاوی ہو لیکن نہ اس کی کوئی منطقی توجیہہ ہو سکے اور نہ کوئی واضح بیان۔

یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف افراد اور ملتیں اپنے ایمان کو مختلف انداز میں بیان کریں لیکن بنیادی حقیقت سب میں مشترک ہو۔

ایمان جبر سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایمان کے بارے میں جبر حرام ہے خواہ وہ جبر خفی ہو یا جلی۔ یہ ایمان کی خامی ہے کہ اس کے لیے جبر کو روا رکھا جائے۔

صحیح ایمان کا فوری انعام یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے بالاتر کر دیتا ہے اسلام میں نجات کا یہی مفہوم ہے۔

ہر اس ایمان میں صداقت کا جزو موجود ہوتا ہے جس نے انسان کے لیے

کسی قسم کی ظاہری و باطنی فلاح پیدا کی ہے۔ ایمان فلاح ہی کی دعوت ہے۔
ایمان استوار ہو کر ایک جذبہ انگیز اور خلاق وجدانِ حیات بن جاتا ہے۔
ایمان سے زندگی میں وقار پیدا ہوتا ہے اور تکریم آدم کا یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ اور انسان محسوس کرتا ہے کہ میں مادّیات و محسوسات و معقولات سے بلند تر مخلوق ہوں۔ (ثقافت، خلیفہ نمبر، ۱۹۶۰ء)

نبیِ کریمؐ کی تعلیم کے بنیادی عناصر

خاتم النّبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی امتیازی خصوصیت اس کی وسعت اور ہمہ گیری ہے۔ بعثتِ محمدی سے قبل لاتعداد انبیاء و مصلحین دنیا میں گزر چکے تھے۔ اسلام نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان سب کی صداقت کا اقرار جزوِ ایمان ہے۔ لیکن مرورِ ایام سے ہر جگہ حق و باطل کی آمیزش ہو گئی ہے اور ہر جگہ ادیان میں غلو پیدا ہو گیا ہے۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ وضاحت کے ساتھ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کیا جائے، اور اس کے علاوہ ان تمام اساسی حقائق کو ایک تنظیم میں یک جا کیا جائے جو مختلف زمانوں اور مختلف ملتوں میں منتشر ہیں۔ تعلیمِ محمدی کی اساس توحید ہے۔ اگر خدا کی ذات اور اس کی صفات کے متعلق انسان کا عقیدہ منزّہ اور خالص ہو جائے تو باقی تمام صداقتیں لازمی نتائج کے طور پر حاصل ہو جاتی ہیں۔ گویا توحید ایک لبریزِ حیات تخم ہے، اور اگر قلبِ انسانی اس کی آبیاری کرے تو حیات و کائنات کے تمام حقائق شاخ و شگوفہ و برگ و ثمر کی طرح اس کے اندر سے پھوٹنے لگیں گے، اور زندگی پھلنے پھولنے اور پھیلنے لگے گی۔ توحید ہی کے صحیح تصور سے یہ کائنات بھی قابلِ فہم ہو جاتی ہے اور زندگی کا مقصود بھی معین ہو جاتا ہے۔ حکمت یا سائنس کا کام کائنات کی کثرت اور گوناگونی میں وحدتوں کی تلاش ہے جسے حکمت کی زبان میں قوانینِ فطرت کہتے ہیں۔ بتدریج ان وحدتوں یا قوانین کو انجام کار ایک بنیادی وحدت میں منسلک کرنا حکمت کا نصب العین ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ نصب العین خدا ہے:

والی ربک المنتھیٰ

یہ منتہیٰ مبدا بھی ہے۔ جس طرح کہ ایک ثمر کا بیج درخت کی ابتدا ہے اور انجام ارتقا میں

ثمر کی صورت میں اس کی انتہا بھی۔ توحید کے تصورات اسلام سے قبل انبیا نے بھی پیش کیے اور حکمانے بھی۔ لیکن انسانوں کی پستیٔ فکر نے ہمیشہ ان میں شرک کی آمیزش کر دی۔ یا بعض حکما کی طرح ان میں اس قدر منطقی تنزیہہ پیدا کی کہ خدا بے صفات ہو کر ایک مجرّد تصور رہ گیا جس سے نہ عقل بہرہ اندوز ہو سکے اور نہ وہ عملی زندگی میں کام آسکے۔ قرآنی اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ اس تصور کو خالص کرنا تھا۔ آئیں اس پر ایک سرسری نظر ڈالیں کہ ادیانِ عالیہ اور فلسفوں میں خدا کا تصور کس کس طرح مسخ ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کے بلند مذہبی فلسفوں میں خدا کی ذات واجب الوجود کائنات سے اس قدر ماوریٰ ہو گئی تھی کہ شنکر اچاریہ کی ویدانت میں خدا نرگُن یعنی صفات سے معرّا ہو گیا تھا۔ وہ کائنات کا خالق نہ تھا کیونکہ ذات مطلق حقیقی تھی، اور کائنات وہمی مایا یا فریب ادراک۔ انسان کا جسم و نفس بھی کائنات کے ساتھ بے حقیقت ہو گیا تھا۔ خیر و شر کی پیکار بھی وہمی تھی۔ اعمال اور ان کے نتائج بھی غیر حقیقی مظاہر کا تار پود تھے۔ مہاتما بدھ نے برہمنیت میں بہت کچھ اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن وہاں بھی نہ خدا نظر آتا ہے اور نہ نفس انسانی کوئی حقیقی جوہر رہتا ہے۔ سب اعراض ہی اعراض ہیں جن کی تہ میں کوئی جوہر نہیں، اور زندگی کا مقصود ان تمام دھوکوں سے نجات پانا ہے، اور یہ نجات تب تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ تمام آرزوؤں، یہاں تک کہ تمنائے حیات کو بھی بیخ و بُن سے نہ اکھاڑ دیا جائے۔ برہمنیت اور بدھ مت نے زندگی سے گریز کی تعلیم دی تاکہ انسان اعمال اور ان کے تکراری چکر ہی سے نکل جائے۔ ان مذاہب میں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ خدا کبھی کبھی انسان کی صورت میں بغرض اصلاح دنیا میں اترآتا ہے۔ بھگوت گیتا میں اس عقیدے کی نسبت ایک اشلوک ہے جس کا فیضی نے یہ ترجمہ کیا ہے:

بہر بنیاد دیں سست گردد بے — برآریم خود را بشکل کسے

عیسائیت میں بھی یہی اوتار کا تصور تمام دین کا محور بن گیا اور مسیح علیہ السلام کو عیسائیوں نے عین خدا بنا دیا، جو دنیا میں انسان کی صورت میں اس لیے آیا کہ انسانوں کے ناقابلِ معافی گناہوں کا، جو اسے ہبوطِ آدم سے ورثے میں ملے ہیں، کفارہ بن جائے

جن فلسفوں میں خدا کا تصور ملتا ہے وہاں بھی اس سے نہ کائنات و حیات کی توجیہ ہو سکتی ہے اور نہ وہ انسانی زندگی میں کسی کام آسکتا ہے۔ افلاطون کے ہاں خدا ناظم و صناع ہے لیکن اس صفت کا خام مواد اس کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ اصل حقیقت اعیان ثابتہ کی ہے۔ خدا ان کے مقابلے میں ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے ارسطو کے ہاں خدا عقلِ خالص یا فکرِ محض ہے۔ اس فکرِ ازلی کا موضوع و معروض وہ خود ہی ہے۔ موجودات سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ وہ کلیات کا ایک منطقی نظام ہے جو زندگی کے جزئیات سے بے تعلق ہے۔ وہ نہ کائنات کا خالق ہے اور نہ اس کا رب اور ناظم۔ انسان کا انفرادی نفس ایک حادث مظہر ہے جو خدا کے ساتھ دعا یا عبادت کا کوئی رابطہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس نفس کو بقا بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یونانی فلسفے کی آخری صورت فلاطینوس اسکندروی کا فلسفیانہ تصوف ہے جس کے نمایاں نقوش عیسوی اور اسلامی متصوفانہ افکار میں ملتے ہیں۔ اس جدید افلاطونیت میں بھی خدا نہ خالق ہے اور نہ رب۔ وہ ذی ارادہ اور صاحب اختیار ہستی بھی نہیں۔ موجودات اس سے اس طرح سرزد ہوتے ہیں جس طرح سورج سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ وہ اپنی ذات بحت میں تمام صفات سے معرّا یعنی ویدانت کے عقیدے کے مطابق نرگن ہے۔ اس اشعاعِ نور میں جو ہستیاں اس سے جتنی قریب ہیں اتنی ہی منوّر ہیں۔ دوری کے ساتھ نور میں کمی اور ظلمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے جسے ہم مادّی کائنات کہتے ہیں وہ ظلمت کدہ ہے۔ انسان کا جسم بھی اس ظلمت کا ایک پیوند ہے۔ ذاتِ مطلق احدیتِ مطلقہ ہے جس میں نہ ارادہ ہے نہ شعور۔ سب کچھ اسی سے بہ تنزّل سرزد ہوتا ہے۔ وہ خود نہ سمیع ہے نہ علیم نہ بصیر۔

اب اس مختصر تمہید کے بعد ذرا اس کا جائزہ لیجیے کہ محمد رسول اللہؐ نے بذریعۂ وحیِ قرآنی اور بوسیلۂ بصیرتِ ایمانی انسانوں کے سامنے خدا کا کیا تصور پیش کیا۔ اسلام کا خدا ایک ذی شعور اور ذی ارادہ خالق ہے۔ اس نے کائنات کو مقصد اور ارادے سے پیدا کیا۔ وہ خلّاق ہے۔ اس کی صفتِ خلّاقی ازلی و ابدی

ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے خلقت میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس کے ہاں حیات و وجود کے خزانے لامحدود ہیں لیکن وہ ہر چیز کو ایک انداز سے پیدا کرتا ہے۔ وہ خالق ہونے کے علاوہ ناظم بھی ہے۔ اس کے ارادوں میں تلوّن نہیں ہوتا۔ اس کی خلاّقی اس کی حکمت سے بھی ہم آغوش ہے اور اس کی رحمت عامہ سے بھی ہمکنار ہے۔ اس کی رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔ وہ کائنات اور موجودات سے ماورائی بھی ہے اور اپنی قدرت، مشیت اور حکمت سے ذرے ذرے میں جاری و ساری بھی ہے۔ اس کی سنت یا عادت فطرت کے اندر آئین آفرین ہے:

لن تجد لسنة الله تبدیلا	اس کے آئین تبدیل و تحویل سے بری ہیں

فطرت انسانی کو اس نے اپنی فطرت کے مطابق وضع کیا ہے اس لیے انسانی زندگی کے بنیادی حقائق بھی حقائقِ الٰہیہ ہیں۔ انہی حقائق کا ادراک اور ان کے مطابق زندگی کو ڈھالنا دین کہلاتا ہے:

فطرۃ الله التی فطر الناس علیھا	اللہ کی اس فطرت پر غور کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔
ذالک الدین القیم	یہی دین قیم ہے
لا تبدیل لخلق الله	اللہ کے قانونِ خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی

اس کائنات میں انسان خدا کا شاہکار ہے۔ قرآن کا آدم مسجودِ ملائک اور مسخرِ کائنات ہے۔ اس سے کوئی ایک فرد مراد نہیں بلکہ یہ انسانیت کا نصب العین ہے۔ خدا کا عابد اور ساجد ہونے سے وہ فطرت کی تمام قوتوں کا مسجود ہو جاتا ہے۔ خدا کا محکوم ہو کر وہ کائنات پر حکمران بن جاتا ہے۔ اخلاق الٰہیہ کے تخلق سے وہ خلافت کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ انسان کے ممکنات کی کوئی انتہا نہیں کیونکہ زندگی کا ارتقا کہیں ختم نہیں ہوتا۔ اسلام نے خدا کے تصور کے ساتھ ساتھ کائنات اور انسانیت کے تصور کو بھی درست کر دیا۔ اس نے کہا کہ خدا خلاّقِ حقیقت ہے وہ باطل آفرینی نہیں کر سکتا۔ حیات و کائنات محض کھیل تماشا نہیں۔ مقاصدِ وجو

نہایت سنجیدہ و پائدار ہیں:

ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا   اے ہمارے رب تونے اسے بے حقیقت نہیں پیدا کیا ہے۔

اسلام حریت، اخوت و مساوات کی تعلیم ہے۔ حریت یعنی آزادی آدمیت کے جوہر میں فطری طور پر موجود ہے۔ آدم نے حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کر کے آزادی کا ثبوت دیا۔ آزادی کے معنی میں یہ داخل ہے کہ اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ لیکن خلاف ورزی کے احساس کے بعد تائب ہونا بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آدم کے قصے کو بیان کر کے قرآن نے گناہ کا تصور بھی بدل دیا۔ عیسائیت نے آدم کی لغزش کو ناقابلِ معافی قرار دیا اور اس کے گناہ کو آیندہ آنے والی لاانتہاہی نسلوں کے لیے متوارث بنا دیا۔ نبی کریمؐ کے ذریعہ سے انسانوں کو اس غیر منصفانہ تصور سے نجات ملی۔ قرآن نے کہا کہ ایک فرد کا گناہ اس کی انفرادی لغزش ہے اور تائب ہونے سے انسان اس کے خراب نتائج سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ نیکیاں بدیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہیں:

ان الحسنات یذھبن السیئات   نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔

ہر فرد اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ روحانی حیثیت میں کسی انسان کا بوجھ دوسرے انسان پر نہیں ڈالا جاتا:

لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ   کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا

چونکہ خدا انسان کو اپنی فطرت پر ڈھالنا چاہتا ہے اس لیے وہ اس کے اختیار کو سلب نہیں کرتا۔ وہ ہدایت اور گمراہی کی راہوں کو واضح کر دیتا ہے۔ جس کا جی چاہے یہ راستہ اختیار کرے یا وہ۔ جو راستہ بھی اختیار کرے گا اس کے نتائج سے وہ گریز نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تمام انسانوں کو بالجبر مومن بنا دیتے لیکن ہم نے ایسا کرنا نہیں چاہا۔ اس لیے کہ جبر اور ایمان باہم منافی چیزیں ہیں۔ مجبور کے لیے نہ نیکی نیکی ہے اور نہ

بدی بدی۔ اور جبر کے بعد ثواب و عذاب کے بھی کچھ معنی نہیں رہتے۔ اسی لیے قرآن کریم نے علی الاعلان کہہ دیا کہ دین کے معاملے میں جبر ناروا ہے:

لا اکراہ فی الدین — دین میں کوئی جبر نہیں

جب خدا جو قادرِ مطلق ہے انسان پر جبر روا نہیں رکھتا تو کسی انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کو مجبورِ محض یا غلام بنائے۔ اگر مسلمان قرآن کریم کی اس حکیمانہ تعلیم کے نتائج اخذ کر کے ان کا اطلاق پوری طرح معاشرت پر کرتے تو بیک قلم دنیا سے غلامی کا صفایا ہو سکتا تھا لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس معاملے میں ڈھیل برتی۔ غلاموں کے ساتھ سلوک دیگر اقوام کے مقابلے میں تو بہتر ہو گیا لیکن یہ انسانیت کُش رسم باقی رہی۔ دین کے معاملے میں رواداری اسلامی تعلیم کا سب سے زیادہ قابلِ فخر پہلو تھا۔ لیکن روح اسلام سے بے گانہ مدعیانِ دین نے غیر اسلامی تنگ نظری اور تعصب سے کام لے کر خود مسلمانوں کے اندر جبر و تعدی اور تکفیر کا بازار گرم کر دیا۔

قرآن نے نجات کو کسی ملت کا اجارہ قرار نہیں دیا اور جو لوگ شریعتِ محمدی کے دائرے میں داخل نہ ہو سکے ان کے ساتھ بھی کمال درجے کی رواداری برتی۔ جس وقت یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے اس وقت بھی انصاف سے کام لے کر یہ کہا کہ دیکھو سب کے سب ایک جیسے نہیں ہوتے اور اہل کتاب میں بھی بڑے بڑے خدا ترس اور خدا پرست موجود ہیں، اور بعض دوسری ملتوں کا نام لے لے کر وضاحت سے کہا کہ ان میں کا جو فرد بھی خدا پرست، آخرت کا قائل اور انسانوں کا محسن ہے وہ نجات یافتہ ہے۔ ایسے لوگ اگر دوسری ملتوں میں بھی ہوں تو وہ اولیاء اللہ اور خوف و حزن سے بالاتر ہیں:

لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون — نہ ان کے لیے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے

محض اتفاق سے مسلمانوں کے گھروں میں پیدا ہونے والے مردم شماری کے مسلمان اسلام یا نجات کے ٹھیکیدار نہیں۔ اسلام کی تعلیم کا جتنا حصہ جو فرد یا

جو ملت اپناتی ہے اتنی وہ اسلام سے بہرہ اندوز اور صلاح و فلاح کے قریب ہے۔ نبی کریمؐ نے اعلان کیا کہ اسلام نے بادشاہی اور شہنشاہی کو منسوخ کردیا ہے:

لا قیصر ولا کسریٰ

لیکن مسلمانوں میں یہ ملعون چیز جلد واپس آگئی اور روحِ اسلام سے بے گانہ شعراء و شیوخ نے ان مصادرِ ضلالت کو ظلّ اللہ قرار دے کر مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی حریت کو مسخ کردیا۔ اسلام نے زر، زمین کی سرمایہ اندوزی کے راستے بند کیے تھے مگر تھوڑے ہی عرصے میں یہ مخرّبِ انسانیت راہیں پھر کشادہ ہوگئیں اور ہمارے علمائے سُو ان کے جواز میں قرآن و حدیث کی تاویلیں کرنے لگے۔ اسلامی حریت کا ایک لازمی تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان زندگی کے حقائق پر آزادی سے غور و خوض کریں اور تغیرِ احوال کے ساتھ ساتھ اسلام کے ازلی اصول سے ہنگامی طور پر فروع کو اخذ کریں۔ اسی کا نام اجتہاد ہے۔ لیکن مسلمانوں کی زندگی کے جامد ہونے کے بعد یہ عقیدہ استوار ہو گیا کہ فقہ میں اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے بعد قیامت تک کے لیے بند ہوگیا ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے فقط لکیر کا فقیر ہونا اور روایت پرستی باقی رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو لازمی ہونا چاہیے تھا۔ بقول اقبال یہ امت روایات میں کھو گئی، اور زندگی کی تخلیقی قوتیں جنھیں اقبال عشق کہتا ہے ٹھٹھر کر رہ گئیں:

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے ۔۔۔ مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

لیکن مسلمان کے پاس خدا کی کتاب محفوظ ہے اور رسولؐ کے اسوۂ حسنہ پر نظر رکھنے والا اب بھی تمام برکات سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کو زندگی کے بنیادی حقائق اور اصولِ عمل دوسروں سے اخذ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر خدا ہے تو اس کا تصور اسلام سے خالص تر کہیں نہیں مل سکتا۔ سچی آزادی

اور عدل و رحم کی تعلیم حقیقی اسلام سے بڑھ کر کہیں نہ ملے گی۔ حصولِ علم کی ترغیب قرآن سے زیادہ کسی مذہبی صحیفے میں نہ پاؤ گے۔ اسلام کا مقصود یہ ہے کہ اسی زندگی میں جمال و کمال پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو یہاں کور باطن ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہو گا۔ زندگی کی کسی جائز لذت کو اسلام نے حرام نہیں کیا۔ قرآن پوچھتا ہے کہ بتاؤ کون ہے جس نے اللہ کی زینتوں کو حرام کیا ہے؟ رہبانیت کو اسلام نے ممنوع قرار دیا تاکہ زندگی کی پیکار سے فرار ناممکن ہو جائے حدود اللہ کو مدنظر رکھ کر زندگی بسر کرنے سے انسان پر عرصۂ حیات تنگ نہیں ہو جاتا بلکہ خدائے لامحدود سے رابطہ پیدا کر کے زندگی لامحدود بن سکتی ہے۔

رسول کریمؐ کی ہمہ گیر اور محیطِ کل حیاتِ طیبہ سے بہتر نمونہ تاریخ انسانی میں مفقود ہے۔ افلاس میں زندگی کس طرح بسر کی جائے۔ مال کے حصول کے بعد زندگی کا کیا ڈھب ہو۔ ایمان داری سے تجارت کس طرح کی جائے۔ زراعت میں نفع اندوزی سے کس طرح پرہیز کیا جائے۔ ضرورت سے زیادہ مال کا کیا مصرف ہے۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق و فرائض میں کس قدر مساوات ہے۔ صلح و جنگ کے آئین کیا ہیں۔ مسلمانوں کو آپس میں کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔ غیر مسلموں کے ساتھ عدل و رواداری کا سلوک۔ جمہوری نظام مملکت، جس کا نظم و نسق اہل الرائے کے مشورے سے قائم کیا جائے۔ اقتصادی نظام جس میں دولت چند ہاتھوں میں مرتکز نہ ہوتی جائے بلکہ خون کی طرح تمام جسم ملت میں رواں دواں ہو اور چند معین حدود کے علاوہ زندگی کے تمام متغیّرہ شعبوں میں مسلسل اجتہاد۔ یہ تھا اصل اسلام جس پر عمل کر کے رسول کریمؐ اور صحابہ کرامؓ نے دنیا کے سامنے عملاً ایک نصب العین پیش کیا۔ مسلمان اگر خودداری کے ساتھ مہذب اور ترقی پذیر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو قرآن اور اسوۂ رسولؐ کی طرف عود کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اگر دیگر اقوام نے اسلام کے بعض اہم پہلوؤں کو اپنا کر اپنی انفرادی اور اجتماعی

زندگی میں صلاح و فلاح پیدا کی ہے تو مسلمانوں کے لیے باعث شرم ہے کہ وہ دوسروں سے پیچھے رہ کر ان کی تقلید پر مجبور ہو جائیں۔ اصل اسلام اور اسوۂ حسنۂ رسولؐ کی طرف عود کر کے ملتِ اسلامیہ دوسروں سے بہتر نمونے پیش کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ رسولؐ کوئی ماضی کی شخصیت نہیں۔ وہ انسانیت کے حال اور مستقبل میں ہر قدم پر رہنمائی کر سکتا ہے بشرطیکہ جامد مسلمان رسولؐ کی رسالت کو بھی جامد نہ بنا دیں۔ ختمِ نبوت کے یہی معنی ہیں کہ یہ نبوت اب ہمیشہ تک اقوام کی رہنمائی کر سکتی ہے۔

(ثقافت، جنوری ۱۹۵۷ء)

وحدتِ انسانی اور عقیدۂ توحید

از روئے قرآن اصلِ دین اور مغزِ صداقت عقیدۂ توحید ہے۔ مصدرِ ہی حقیقت ہے اور خلقتِ حیات و کائنات، آفرینشِ انسان، آئین و قوانینِ مقصودِ زندگی، اخلاقی اور روحانی تعلیمات، تمام اسی مرکزی عقیدے کے مشتقات ہیں۔ اس عقیدے کی بدولت جو نظریۂ حیات اور طریقِ عمل پیدا ہوتا ہے اس کا نام قرآن نے اسلام تجویز کیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ سچا دین یہی ہے۔ اس سے متضاد جو عقیدہ اور طرزِ عمل ہے وہ باطل ہونے کی وجہ سے خدا کے ہاں مقبول نہیں۔ اس عقیدے کی نسبت قرآن میں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ تمام اقوام و ملل میں اس عقیدے کی تعلیم دینے والے فرستادگانِ خدا مبعوث ہوئے۔ دین اصل میں ایک ہی تھا اور ایک ہی ہے۔ مختلف امتوں اور ملتوں نے اس عقیدے کو بگاڑ کر اور اس میں کچھ قطع و برید اور کچھ اضافہ کر کے ایک دینِ واحد سے مختلف ادیان بنا لیے ہیں۔ قرآن میں یہ دعویٰ کہیں نہیں ملتا کہ محمدؐ رسول اللہ کا پیش کردہ دین کوئی نئی اور انوکھی تعلیم ہے۔ ابتدائے آفرینشِ آدم سے لے کر بعثتِ رسولؐ تک دین ایک ہی رہا ہے اور قیامت تک دین ایک ہی رہے گا۔ اس ایک دینِ واحد میں تفریقیں کئی وجوہ سے پیدا ہوئیں۔ ایک بڑی تفرقہ انگیز وجہ یہ تھی کہ مختلف ادیان کے پیرووں پر یہ حقیقت واضح نہ ہوئی کہ دیگر اقوام و ملل کے پیشوایانِ دین بھی ہادیانِ برحق تھے۔ جب کوئی نبی کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو پہلے اس کی اپنی قوم اس سے دست و گریبان ہوتی ہے۔ اس کو جھٹلاتی ہے۔ درپئے آزار ہوتی ہے اور آمادۂ قتل ہو جاتی ہے۔ لیکن انجام کار اس کے پیغام کو سمجھنے والے کچھ لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور

رفتہ رفتہ اس کا بول بالا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ زیادہ زمانہ گزرنے نہیں پاتا کہ نبی کے پیغام اور اس کی تعلیم میں تخریب و تحریف رونما ہوتی ہے۔ حق کے ساتھ باطل کی آمیزش شروع ہو جاتی ہے۔ غلو کی وجہ سے بھی حق باطل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خدا کے پیغام رساں نبی کو اس کی امت خدا کا مرتبہ دے کر اس کی پرستش شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح ایک امت اپنے نبی کو تو خدا بنا دیتی ہے لیکن دوسری امتوں کے انبیا کو سچا انسان بھی نہیں سمجھتی۔ اسی غلو اور تعصب کی بدولت نوعِ انسان متخاصم گروہوں میں بٹ جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عقیدۂ توحید جو نوعِ انسان میں وحدت آفریں ہو سکتا تھا وہ عداوت بین الملل کا باعث بن جاتا ہے۔ مذہب نوعِ انسان کے لیے باعثِ عذاب بن جاتا ہے۔ مذہبی تعصب انسان کے انسان سے متحد ہونے میں مانع ہوتا ہے قرآن کے نزدیک اس قسم کے تمام متعصب لوگ کافر ہیں۔ ان کی نظر میں تنگی اور کجی آجاتی ہے، ان کے دل تنگ ہو جاتے ہیں۔ ان کے فکر میں وسعت نہیں رہتی۔ ان میں محبت کا جذبہ محو و مفقود ہو جاتا ہے۔ رواداری کا نشان نہیں رہتا اور دین کے بارے میں جبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنی ملت کے علاوہ باقی تمام ملتیں گردن زدنی بن جاتی ہیں۔ غرضیکہ مذہب فلاح کی بجائے فساد کا باعث بن جاتا ہے۔ دیکھیے قرآن نے کس قدر وضاحت سے اس ناگوار حالت کا نقشہ کھینچا ہے، جو عذاب مبین میں منتج ہوتی ہے:

ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا ۝ اولئک ھم الکفرون حقاً

جو لوگ اللہ اور اس کے انبیا میں تفریق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور بین بین چلنا چاہتے ہیں، یہ لوگ صحیح معنوں میں کافر ہیں اور ہم نے ان کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا

واعتدنا للکفرین عذاباً مھیناہ	ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے انبیا
والذین اٰمنوا باللہ ورسلہ و	پر بلا تفریق ایمان لاتے ہیں ہم ان کو
لم یفرقوا بین احد منھم اولٰئک	(اس صالح عقیدے کا) عنقریب اس کا
سوف یؤتیھم اجورھم وکان	اجر دیں گے۔
اللہ غفوراً رحیماہ	

اس آیت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس رہوا کن عذاب کی وعید ہے وہ ان کی حالت سے اسی حیاتِ دنیوی ہی میں رونما ہوتا ہے۔ اسی طرح عقیدۂ صالح کے مفید نتائج بھی امنِ عامہ کی صورت میں یہیں ظاہر ہو جاتے ہیں۔

قرآن میں پیش کردہ اسلام کے دو اہم ارکان ہیں۔ ایک وحدتِ الٰہ دوسرا وحدتِ انسان۔ جس کی بنیاد ایک تو نوعِ انسان کا واحد ماخذ ہے اور دوسری بنا وحدتِ ادیان ہے۔ اس کی صراحت قرآن میں یوں ہے:

خلقکم من نفس واحدۃ	اس نے تمھیں ایک ہی جوہرِ حیات سے پیدا کیا
ما کان الناس الا امۃ واحدۃ	انسان ایک ہی امت ہیں لیکن لوگوں نے
فاختلفوا۔	اختلاف پیدا کر لیا۔
وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر	ہر امت میں نذیر پیدا ہوتے رہے ہیں۔
ولکل قوم ھاد	ہر قوم میں ہادی ہوئے ہیں۔

قرآن نے یہ بھی کہا کہ خدا کے نزدیک تمام انبیا راستی پر تھے۔ ان تمام کا درجہ اللہ کے ہاں متفاوت ہے۔ بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔ لیکن بنیادی لحاظ سے ان میں فرق کرنا درست نہیں۔

انسانوں کے لیے یہی مناسب اور واجب ہے کہ وہ یہ کہیں کہ ہم ان میں فرق نہیں کرتے۔ انسانوں کے لیے ایک پیشوائے دین کو دوسرے سے افضل قرار دینا مناقشات و فسادات کا باعث ہوتا ہے۔ اسی قرآنی ہدایت کی توجیہ میں رسولِ کریمؐ نے یہ فرمایا کہ تم یہ بھی مت کہو کہ میں یونس ابن متی سے

بھی افضل ہوں۔

امریکہ کے خطاباتی دورے میں میں نے ایک بڑے کالج میں اسلام کے عقیدۂ توحید اور اس کے مشتقات پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اس کے بعد ایک پادری میرے درپے ہو گیا کہ بتاؤ مسیحؑ اور محمدؐ میں تم کس کو افضل قرار دیتے ہو۔ میں نے کہا کہ خدا اور رسول نے مجھے اس قسم کے مباحث میں پڑنے سے منع کیا ہے کہ ایک نبی کو دوسرے سے افضل قرار دیا جائے۔ ان کے مدارج میں اگر کچھ تفاوت ہے تو اس کا علم خدائے علیم کو ہے انسانوں کو اظہارِ تفضل کی ممانعت کی گئی ہے۔ کیونکہ اس سے جاہلانہ تعصب پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

کلٌ اٰمن باللہ وملٰئکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ لانفرق بین احد من رسلہٖ۔ (البقرہ)	سب مسلم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے صحیفوں پر، اس کے رسولوں پر اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور (مقابلہ و موازنہ سے) ان میں تفریق نہیں کرتے

شدید گمراہی یا کفر اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص خدا اور ملائکہ اور اس کی کتابوں اور رسولوں کا منکر ہو۔ ومن یکفر باللہ وملٰئکتہٖ وکتبہٖ ورسلہٖ والیوم الاٰخر فقد ضل ضلالاً بعیداً (النساء)

امتوں میں تفریق کا ایک اور سبب عبادات و مناسک اور مناہج و شعائر کا فرق بھی ہے۔ اس کے علاوہ معاملات کے بارے میں رسوم و رواج اور قوانین میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کچھ تو قوموں کا تفاوتِ مزاج ہے اور کچھ تاریخی، معاشی اور جغرافیائی حالات کی گوناگونی۔ قرآن اس قسم کے عارضی اور فروعی اختلافات کو مابہ النزاع بنانے سے روکتا ہے۔

لکل امۃ جعلنا منسکا ھم ناسکوہ فلا ینازعنک فی الامر۔	ہر قوم کا طریقہ عبادت جدا ہے۔ اس بارے میں ہرگز تنازع جائز نہیں۔

ہر قوم کا قبلۂ عبادت جدا ہے۔ قبلوں کا اختلاف کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا۔ مشرق میں بھی وجہ اللہ ہے اور مغرب میں بھی وجہ اللہ۔ تمام سمتیں خدا ہی کی ہیں۔

للہ المشرق والمغرب۔ جدھر منہ کرو اللہ ہی اللہ ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ اپنے اپنے طریق عبادت پر قائم رہتے ہوئے بھی تمام ملتوں کو نیکیوں کے حصول میں سبقت کی کوشش کرنی چاہیے۔

ولکلٍ وجھۃ ھو مولیھا۔ فاستبقوا الخیرات۔ — ہر ایک کا ایک رخ ہے جدھر وہ مڑا ہوا ہے لہذا نیکی کی طرف سبقت کرو۔

اینما تولّوا فثم وجہ اللّٰہ — جدھر بھی رخ کروگے ادھر ہی خدا کا رخ ہوگا

لکلٍ جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجاً — تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے قانون اور اس کو بروئے کار لانے کا طریقہ بنا دیا ہے۔

یہود و نصاریٰ نے جو محمد صلعم کو نبی تسلیم کرنے اور ان کی پیروی سے انکار کیا تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے مناہج و شعائر الگ تھے۔ ان کی شریعتیں رسول اکرمؐ کی پیش کردہ شریعت سے بہت کچھ متفاوت تھیں۔ اسی لیے قرآن نے کہا کہ اے محمدؐ! یہ لوگ کبھی تم کو نہ مانیں گے جب تک کہ تم ان کی ملتوں کی پیروی پر آمادہ نہ ہو۔ ملتوں کی پیروی سے مراد ان کے تمام مناہج و شعائر اور شرائع کی پیروی ہے۔ یہود و نصاریٰ سے اس قسم کی ہم آہنگی محمد رسول اللہؐ جیسے انقلاب آفریں مصلح اعظم کے لیے ناممکن تھی۔ کسی انقلابی اصلاحی تحریک کے معنی ہی یہ ہیں کہ بنیادی عقائد کی اصلاح کے علاوہ انداز معاشرت میں بھی اہم تبدیلیاں پیدا کرے۔ اگر رسول کریمؐ عقیدۂ توحید ہی کو کج اندیشیوں سے پاک کر دیتے تو یہ بھی ایک عظیم الشان کام ہوتا لیکن عبادات و قوانین میں بھی اہم تبدیلیوں کے بغیر دین کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ جو مصلح اعظم آتا ہے وہ لازماً زمانے کے انداز و ساز بھی بدلتا ہے۔ جو کہنہ پرست اس کی مخالفت پر کمربستہ ہوتے ہیں ان کا محرک تبدیلئ اصلاح عقیدہ ہی نہیں ہوتا بلکہ آداب و اطوار و آئین میں ایسی تبدیلیاں ان کو ناگوار ہوتی ہیں جن پر ادنیٰ مفاد پرستی یا قدامت پسندی نے تقدس کی مہر لگا رکھی ہے۔ ہر قوم فقط اپنے عقائد ہی کو دین نہیں سمجھتی بلکہ تمام ظواہر و شعائر،

عقائد سے بھی بڑھ کر دین شمار ہوتے ہیں۔ ملتوں میں مخاصمت اور مغائرت، اور عصبیت زیادہ تر انھیں ظواہر نے پیدا کر رکھی ہے۔ ہند اور پاکستان کے ادیان پر نظر ڈالیے تو انسانی فطرت کی کج اندیشی بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ ہندو دھرم کسی معین عقائد کا نام نہیں۔ خدا کو ماننے والے، خدا کے منکر، دیوتا پرست، دیوتاؤں کے منکر، ویدوں کو ماننے والے اور ویدوں کے منکر، کرشن کو اوتار ماننے والے اور اس کو معمولی اخلاق سے بھی معرا سمجھنے والے، غرضیکہ ہر قسم کے خوش عقیدہ، بدعقیدہ اور بے عقیدہ ہندو مت سے خارج نہیں ہو سکتے بشرطیکہ وہ چند ظواہر کے پابند رہیں۔ ان ظواہر میں ذات پات اور چھوت چھات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ امبیڈکر نے بہت درست کہا تھا کہ اگر ہندو مت اس تفریق کو بھی چھوڑ دے تو وہ کچھ نہ رہے گا کیونکہ اس کے سوا کوئی مشترک عنصر اس قوم میں نظر نہیں آتا جو ہندو کہلاتی ہے۔ ہندو صوفی رام تیرتھ نے بالکل درست کہا کہ ہندو مت رسوئی یا مطبخ کا مذہب رہ گیا ہے۔ کیا کھانا اور کس طرح کھانا اور کھانے کو کس کی چھوت چھات سے بچانا، سب زور اسی پر ہے اور عقائد کو کوئی نہیں پوچھتا۔ یہی حال سکھوں کا ہے، اس مذہب میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ جسم کے کسی حصے کے بال نہ تراشے جائیں۔ ہر قسم کی بداخلاقی اور بدعقیدگی کے باوجود ایک سکھ، سکھ رہتا ہے اور ملت اس کو خارج نہیں کرتی۔ لیکن بال تراش دینے کے بعد مذہب کا بھی صفایا ہو جاتا ہے۔ گویا کہ تمام دین سمٹ کر بالوں ہی میں الجھ گیا ہے۔ پنڈت نہرو نے ایک مرتبہ کہا کہ ہندو کلچر اب زیادہ تر گوبری ہو گیا ہے۔ گئے اور اس کے بول و براز کو جو اہمیت حاصل ہے وہ نہ کسی عقیدے کو حاصل ہے اور نہ کسی عمل کو۔ ملتیں ایک دوسرے کے شعائر کی ہنسی اڑاتی ہیں۔ مگر جس ملت کے جو شعائر ہیں وہ اس کے نزدیک نہایت ضروری اور پسندیدہ ہوتے ہیں۔ انھیں شعائر کی نسبت قرآن کریم نے کہا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ۔

عبادات و اعمال و شعائر میں ہر ملت کو اپنے طریقے پسند ہیں۔ مگر قرآن کہتا ہے کہ نوعِ انسان میں وحدت و اشتراکِ عمل ان اختلافات کے باوجود پیدا ہو سکتا ہے اور اس سمت میں اسلام کی کوششوں کا خود قرآن شاہد ہے۔ جب اس امر کا تجربہ ہو گیا کہ ایسے مذاہب کے پیرو جن کی اصل توحید تھی محض شعائر اور شرائع کے اختلافات اور مصنوعی امتیازات کی وجہ سے برسرِ پیکار رہتے ہیں تو قرآن نے ان کے پیرووں کو یہ دعوت دی کہ ہم ایک بنیادی بات پر یکجا ہو جائیں جو ہم میں اور تم میں مشترک ہونی چاہیے۔ اخلاقیات کے بنیادی عناصر تمام مہذب اقوام اور ادیانِ عالیہ میں مشترک ہوتے ہی ہیں۔ زنا، چوری ظلم، قتلِ ناروا کس مذہب میں جائز ہے؟ —— اس کے علاوہ اگر عقیدۂ توحید میں بھی ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو مہذب دنیا میں بہت حد تک وحدت پیدا ہو سکتی ہے:

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواءٍ بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ۔	کہہ دو کہ اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہو اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کریں اور ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے مقابلے میں رب نہ بنائے۔

(ثقافت، مئی، ۱۹۵۹ء)

قرآن کریم میں حکمت کا مفہوم

قرآن کریم کے اندر خود اسی کتاب مقدس کے کچھ صفات اور امتیازی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ کہیں اسے کتاب 'لاریب فیہ' کہا ہے کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یقینی ہے اس کے اندر شکوک کی گنجائش نہیں۔ کہیں اسے فرقان کہا گیا ہے جو حق و باطل کو دو ٹوک الگ الگ کر دے۔ کہیں اس کو نور سے تشبیہہ دی گئی ہے جو زندگی کی ظلمتوں کو دور کرتا اور ارواح انسانی کو منیر و مستنیر کرتا ہے۔ کہیں اس کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ وہ نبی اُمّی جو اس قرآن سے فیض یافتہ ہے بیہودہ رسوم و رواج اور گمراہ ادیان کی پہنائی ہوئی زنجیروں کو توڑتا اور توہمات کے طوق سے انسانوں کی گلو خلاصی کراتا ہے۔ کہیں یہ بیان ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے اہم شعبوں کے متعلق مفصل تعلیم موجود ہے۔ کہیں یہ ارشاد ہے کہ تم اس کے اندر کوئی داخلی تضاد نہ پاؤ گے اس کی تمام تعلیمات باہم متوافق ہیں۔ ہر صفت اس کتاب اور اس کی تعلیم کا کوئی اہم پہلو بیان کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمایئے:

(۱) ذٰلک الکتاب لاریب فیہ (یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شبہ و شک کی گنجائش نہیں)

(۲) ھدًی للناس وبینٰت من الھدٰی والفرقان (یہ کتاب لوگوں کے لیے ہدیٰ ہے ہدیٰ کے واضح دلائل ہیں اور "فرقان" ہے)

(۳) ..... واتبعوا النور الذی انزل معہ (اور وہ اس "نور" کی پیروی کرتے ہیں جو رسول امی کے ساتھ نازل کیا گیا)

(۴) ویضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم (اور وہ اس

بوجھ و اطواق کو ان پر سے ہٹاتا ہے جو ان پر پڑی تھیں)

(۵) ونزلنا علیك الکتاب تبیانا لکل شیئ (ہم نے تم پر وہ کتاب اتاری جو تمام چیزوں کی تفصیل پر مشتمل ہے)

(۶) لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا (اگر یہ کتاب غیر خدا کی طرف سے ہوتی تو اس میں بڑے اختلافات دیکھتے)

لیکن اس مختصر مضمون میں ہم قرآن کریم کے اس دعوے کو جانچنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ قرآن حکیم ہے، وہ حکمت والے حکیم مطلق کی نازل کردہ کتاب ہے، اس لیے اس کے اندر حکمت سموئی ہوئی ہے۔ یہ کتاب حکمت کو خیر کثیر بھی کہتی ہے:

من یؤتی الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا

انبیا کے وظیفۂ نبوت کے متعلق بھی ارشاد ہے کہ وہ انسانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کتاب کے ساتھ ساتھ حکمت کا بیان بالالتزام کیوں آتا ہے اور حکمت کے کیا معنی ہیں۔ ذیل میں کچھ آیات درج کی جاتی ہیں جن میں کتاب و حکمت کا ساتھ ساتھ ذکر ہے:

(۱) .... لما اتیتکم من کتب وحکمۃ .... (۳: ۸۱) (اے پیغمبر! ہم نے جو تمھیں کتاب و حکمت دی)

(۲) .... یعلمھم الکتب والحکمۃ .... (۲: ۱۲۹ و ۲: ۱۴۴) (یہ رسول ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے .....)

(۳) .... یعلمکم الکتب والحکمۃ .... (۲: ۱۵۱) (تمھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے)

(۴) .... نعلمہ الکتب والحکمۃ .... (۳: ۴۸) (اللہ مسیح کو کتاب و حکمت سکھاتا رہا)

(۵) .... فقد اتینا ال ابراھیم الکتب والحکمۃ .... (۴: ۵۴) (اور ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کیں)۔

(۶) ..... وانزل اللہ علیک الکتٰب والحکمۃ ..... (۴: ۱۱۳) ۔

(اور اللہ نے آپ پر کتاب و حکمت نازل فرمائیں)

قرآن کریم کے اندر زندگی کے ہر اہم شعبے کے متعلق احکام موجود ہیں۔ لیکن کہیں قرآن اپنے آپ کو کتاب الاحکام نہیں کہتا۔ اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ احکام صادر ہوتے ہیں بر بنائے حکمت اور ہر حکم کی تہہ میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے جو انفس و آفاق پر غور و خوض کرنے والوں پر ہی منکشف ہو سکتی ہے۔ حکم کو محض بحیثیت حکم پیش کرنا اور اسے واجب الاطاعت گردانا مطلق العنان حکمرانوں کی آمریت سے سرزد ہو سکتا ہے جو بے چون و چرا محکوموں سے فرمانبرداری کے طالب ہوتے ہیں۔ لیکن خدائے کائنات محض حاکم نہیں بلکہ حکیم بھی ہے۔ افلاطون کی مشہور کتاب 'جمہوریہ' میں سقراط کی زبان سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسانی جماعتوں اور ملتوں میں تب تک عدلِ حقیقی قائم نہیں ہو سکتا جب تک یہ صورت پیدا نہ ہو کہ یا تو حکما حکمران بن جائیں یا حکمران حکما بن جائیں۔ ملتوں میں اندرونی اور بیرونی فساد کی وجہ یہی ہے کہ جو حاکم اور صاحبِ اقتدار بن جاتے ہیں وہ حکمت سے معرا ہوتے ہیں اور جو مردِ حکیم ہے اسے سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوتا۔ افلاطون اور سقراط نے قریباً اڑھائی ہزار سال قبل حکومتوں کے جس انداز کو بیان کیا ہے وہ انداز اب بھی کم و بیش ہر حکومت میں پایا جاتا ہے۔ قرآن ایسے خدا اور خلاقِ فطرت کو پیش کرتا ہے جو حاکم ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہے، اس کے ہاں سے ہر حکم کسی نہ کسی حکمت سے سرزد ہوتا ہے۔ بے اصول حکمرانی خود خدا بھی نہیں کرتا جو قادرِ مطلق ہے۔ خدا ہادی ہے صرف انسانوں کا ہادی نہیں بلکہ حجر و شجر، اور شمس و قمر اور ہر ذرۂ کائنات کا ہادی ہے:

ربنا اعطی کل شیء خلقہ ثم ھدی ۔ ہمارے رب نے ہر شے کو اس کی مخصوص بناوٹ عطا کی پھر اس کی رہنمائی کی۔ (۲۰: ۵۰)

کوئی ہدایت بھی محض حکم نہیں ہوتی۔ ہر ہدایت کا سرچشمہ بھی کوئی علت غائی ہوتی ہے اور اسی علت میں اس ہدایت کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ خدا نے دیکھا کہ دنیا کے حکمران کم وبیش حکمت سے معرا ہوتے ہیں۔ ان کے خاندان میں شخصی یا خاندانی یا طبقاتی خود غرضی پنہاں ہوتی ہے۔ ان کے ہاں عدل بے لوث نہیں ہوتا۔ لیکن انسانوں کو ہدایت اور عادلانہ زندگی کی بے حد ضرورت ہے۔ اس لیے خدا نے انبیا کو مبعوث کیا جو خدائے حکیم کے حکیمانہ احکام لوگوں کے سامنے پیش کریں اور ان کو نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن ہر نبی کو مشیت الٰہی نے یہ توفیق عطا نہ کی کہ وہ دنیاوی زندگی میں صاحبِ اقتدار حکمران بھی بن جائے۔ اکثر کے سپرد یہی وظیفہ ہوا کہ وہ صاحب اقتدار طبقوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کریں اور انسانوں کے ضمیروں کو بیدار کریں۔ ان کو ان کے اعمال کے نتائج سے آگاہ کریں، اور معاشرتی عدل پر آمادہ کریں۔ ان میں سے اکثر کی صدا صدا بہ صحرا رہی یا ضمائر انسانی میں محض ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہوئیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ سب انبیا اوامر و نواہی کی تلقین کے ساتھ ساتھ حکمت آموزی بھی کرتے تھے۔ وہ صاحبانِ حکمت بھی تھے۔ وہ اعمال کے فطری اسباب و علل سے بھی لوگوں کو آگاہ کرتے تھے، اور جو کچھ وہ کہتے تھے اس کے معقول ہونے کی کچھ نہ کچھ وجہ بھی بتلاتے تھے۔ نفوس انسانی کی بیماریوں کی تشخیص کرتے اور ان کا علاج بھی تجویز کرتے تھے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انبیا اور حکما دو الگ الگ گروہ ہیں، اور اس تفریق کی بنا پر یہ تصور ہے کہ انبیا جو کچھ کہتے ہیں وہ استدلال سے حاصل کردہ حکمت نہیں ہوتی، بلکہ براہِ راست مبداءِ فیاض سے حاصل کردہ ہدایت ہوتی ہے اور حکما کے متعلق یہ تصور ہے کہ وہ محض عقل اور مشاہدہ سے فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں، اور استقرا، استخراج اور قیاس سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ لیکن قرآن نبی نبوت اور حقیقی حکمت میں کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کرتا۔ وہ اکثر انبیا کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ ان کو حکمت بھی عطا کی گئی۔ اس سے یہ نتیجہ

نکلتا ہے کہ ہر نبی حکیم بھی ہوتا ہے لیکن ہر حکیم نبی نہیں ہوتا۔ اصل حکمت وہ ہے جو نبوت کے ساتھ وابستہ ہو۔ اگر حکمت نبوت سے مطلقاً منقطع ہو جائے تو اس کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی حکمت محض ظن آفرینی اور استدلالی بھول بھلیاں ہو اور دوسرے یہ کہ وہ مظاہر فطرت کے کسی گوشے کے متعلق کوئی جزئی معلومات ہو جو براہِ راست انسانی زندگی میں مؤثر نہ ہو۔

حکمت کے مفہوم میں ذرا مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔ یہ لفظ دینیات سے الگ ہو کر کبھی فلسفہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی سائنس کے معنوں میں فلسفہ کے مسائل اور دین کے مسائل بہت حد تک مشترک ہوتے ہیں اور ان مسائل کے حل کے راستے کچھ دور تک متوازی چلتے ہیں۔ لیکن خاص حدود سے آگے طرزِ استدلال اور حقیقت رسی کے وسائل ایک دوسرے سے ممتاز اور مختلف ہو جاتے ہیں۔ فلسفی بھی زندگی کی اساسی اور کلی صداقتوں اور بنیادی حقیقتوں کو جاننا چاہتا ہے اور دین بھی انھیں حقائق کا نام ہے۔ عقل ایک خداداد جوہر ہے اور انسان کی امتیازی خصوصیت ہے اسی لیے قرآن نے عقل کو استعمال کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ وہ جو تعلیم بھی بذریعہ وحی ربانی پیش کرتا ہے اس کے متعلق ساتھ ہی کہہ دیتا ہے کہ تفکر اور تدبر کرنے والے اولوالالباب اگر اچھی طرح مشاہدہ، مطالعہ اور استدلال کریں گے تو اس کو درست پائیں گے۔ عقل و وحی کا امتیاز اور فرق موجود ہے، لیکن قرآن کے باہمی تخالف کا قائل نہیں۔ اگر ان میں تخالف ہوتا تو قرآن اپنے آپ کو حکمت کی کتاب نہ کہتا، اور نہ مظاہر فطرت کے مطالعہ سے حقیقت رسی پر اس قدر زور دیتا۔ قرآن کی تعلیم میں یہ یقین موجود ہے کہ حکمت کا صحیح استعمال انجام کار حقائق دینیہ کی ضرور تائید کرے گا۔ قرآن حکیمانہ جدوجہد کو جزو دین اور جزو عبادت سمجھتا ہے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ شرح صدر سے سوچنے والے فلسفی اور نبی میں فرق کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ نبی کے ہاں صرف مشاہدۂ کائنات اور

استدلال ہی نہیں بلکہ براہِ راست کچھ حقائق کا وجدان اور ادراک ہے۔ یقین فلسفی میں بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ علم الیقین کی حد تک رہتا ہے۔ اس سے آگے عین الیقین اور آگے بڑھ کر حق الیقین کا درجہ ہے۔ یہ آخری دو درجے محض استدلال سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ سوانح میں ابو سعید ابو الخیر مشہور صوفی اور اس کے ہم عصر بو علی سینا کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بو علی ان کے سامنے حقائقِ حیات و کائنات پر عقلی گفتگو کرتا رہا اور از روئے عقل و حکمت ان تمام حقائق کی تائید کرتا گیا جن کی تعلیم دین میں ملتی ہے۔ ابو سعید نے اس تمام حکیمانہ استدلال کے جواب میں فقط یہ کہا: "ہر چہ تو می دانی من می بینم"۔ یہ دانش اور بینش کا بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو اقبالؒ نے بھی جا بجا مختلف دل کش پیرایوں میں بیان کیا ہے:

عقل گو آستاں سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں

یہ حضور وہی ہے جسے کوئی مشاہدہ کہتا ہے کوئی وجدان کہتا ہے کوئی مکاشفہ کہتا ہے۔ انبیا کے ہاں اس کی جو صورت اور جو درجہ ہے اسے وحی کہتے ہیں۔ اقبال نے اس کے لیے عشق کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ رومی اور بو علی کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اسی عشق کو سوزِ دل قرار دیتا ہے، جس کے بغیر عقل خنک حقیقت شناس نہیں ہو سکتی۔ اقبال کے نزدیک حکمت ایک ٹھنڈی اور بے سوز آگاہی ہے:

حق اگر سوزے ندارد حکمت است شعر مے گردد چو سوز از دل گرفت

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

عشق اور سوز، وجدان اور مشاہدہ کے بغیر حکمت خیر کثیر ہونے کے باوجود خیر کامل نہیں بنتی۔ نبی کے ہاں وجدان و فکر اور قول و فعل سب ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ حکیم عقلی کے ہاں یہ ہم آہنگی لازمی نہیں۔

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور حکیم سرِ محبت سے بے نصیب رہا

حکما کی وہ قسم جنھیں فلسفی نہیں بلکہ سائنس داں کہتے ہیں الگ نوعیت کی ہے۔ خارجی اور باطنی فطرت کے بے شمار مدارج اور بے شمار شعبے ہیں۔ فطرت کے مظاہر کی نوعیت الگ الگ ہے۔ کہیں مادی مظاہر ہیں، کہیں نباتی، کہیں حیوانی۔ کہیں اجرامِ فلکی کا عالم ہے، کہیں انسانی جسم کا مطالعہ ہے۔ کہیں اس کی نفسیات کا۔ خدائے واحد کی کائنات ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس کا کوئی حصہ دوسرے حصوں سے مطلقاً بے تعلق نہیں۔ لیکن اس وحدت کے اندر ایک بے پایاں تنوع اور کثرت ہے جو بیک وقت کسی انسان کے محدود مطالعہ اور مشاہدہ اور استدلال کے احاطے میں نہیں آسکتی۔ انسان کی محدود قوتوں نے مظاہرِ عالم کے مطالعہ کے لیے ان کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کردیا تاکہ کسی ایک شعبے کے آئین ادراک کی گرفت میں آسکیں۔ کوئی سائنس داں تمام عمر ایک کیڑے کے مطالعہ میں صرف کردیتا ہے کوئی انسان کے کسی ایک عضو کے اعمال و وظائف میں مہارت پیدا کرتا ہے۔ کوئی ذرّے یا ایٹم کی اتھاہ تحقیق میں منہمک ہے۔ یہ سب حکمت ہی کے گرویدہ اور اسی کے متلاشی ہیں۔ لیکن جزوی حقائق کی تحقیق کے لیے جزوی ہی عقل بھی استعمال ہوتی ہے۔ علوم میں جس قدر تخصیص ترقی کرتی جاتی ہے اسی قدر ایک سائنس داں ایک جزو کا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر اجزائے حیات و کائنات سے جاہلِ مطلق ہوتا جاتا ہے۔ وہ کم سے کم چیز کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی کوشش میں کلیاتِ حیات سے بے گانہ ہوجاتا ہے۔ لیکن زیرِ تحقیق جزو کے بھی اگر وہ تمام پہلو جان جائے تو وہ بھی حقائقِ کلیہ سے آشنا ہوجائے، مگر وہ خود اپنے مطالعہ کو خاص حدود کے اندر کرلیتا ہے۔ ہر جزو ایک کُل کا جزو ہے اور وہ کل پھر کسی اور کل کا جزو ہے الیٰ لا انتہا ھی۔ مشہور انگریز شاعر ٹینی سن ایک پھول کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اگر مجھے تیری پوری حقیقت معلوم ہوجائے تو انسان اور خدا کی معرفت بھی مجھے حاصل ہوجائے۔ قرآن کریم میں حکمت کا تصور اور نصب العین یہی ہے۔ قرآن فطرت کے مطالعہ

کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن یہ تاکید کرتا ہے کہ فطرت کے ہر مظہر کو اس کے مصدرِ مطلق اور خلاقِ واحد کے ساتھ وابستہ کر کے سمجھو اور یہ دیکھو کہ فطرتِ کلی اور فاطر السمٰوٰت والارض کے ساتھ اس کا رابطہ کس قسم کا ہے اور کس طرح ہر جزو کل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن کے نزدیک حکمت اسی کا نام ہے۔ فطرت کے جزوی مظاہر اور ان کے مطالعہ میں کھو یا جانا حکمت نہیں۔ وہ حکمت جسے قرآن خیرِ کثیر کہتا ہے محض انسانی اعمال اور ان کے متعلق احکام سے بلند تر چیز ہے۔ اگرچہ انسان کے صحیح اعمال اسی حکمت سے سرزد ہوتے ہیں، کیونکہ انسان کے اعمال کائنات کی حقیقتِ کلی سے منقطع اور الگ نہیں ہو سکتے۔ ایک حکمت وہ ہے جو محض ذرائعِ اعمال اور وسائلِ حیات کے علم تک محدود ہے۔ لیکن قرآن جسے حکمت کہتا ہے وہ مقاصدِ حیات کا علم ہے۔ اگر حکمت کی جد و جہد مقاصدِ حیات تک نہ پہنچ سکے اور انسانی زندگی کے نصب العین کو واضح نہ کر سکے تو وہ ادھوری رہ جاتی ہے، اور بعض اوقات ادھورا علم جہالت سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے:

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطوں شو | اگر میانہ گزینی سراب و تشنہ لبی است

قرآن کریم کی تعلیم کی اساس توحید ہے۔ یعنی حیات و کائنات کا سرچشمۂ وجود اور مصدرِ ہستی ایک ہی ذات ہے۔ فلسفی اور سائنس دان مظاہرِ وجود میں علت و معلول سبب و اثر کے رابطے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ عام زبان میں بھی کسی چیز یا کسی واقعہ کو جاننے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ انسانی عقل اس کو کسی قاعدے کسی قانون کے تحت میں لے آئی ہے۔ قانون کے معنی تغیر میں ثبات کی تلاش ہے۔ عالمِ ظاہر و باطن میں ہر مظہر ہر وقت تغیر پذیر رہتا ہے۔ بادی النظر میں تمام ہستی تغیر پذیر معلوم ہوتی ہے۔ کثرت ظاہر ہے اور وحدت پنہاں۔ جب انسان متغیر حوادث کی کثرت میں کسی آئین کو تلاش کر لیتا ہے تو کثرت اور تغیر میں ثبات اور وحدت کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ حکمت کی تلاش میں

انسان جزئیات کو کلیات میں پروتا چلا جاتا ہے۔ پھر کئی کلیات کو کسی ایک کلیہ کے تحت میں لے آتا ہے۔ عقل و فہم کی ترقی سے کلیات کی تعداد اوپر چڑھتے چڑھتے کم ہوتی جاتی ہے۔ نباتات میں ہر اگنے والی چیز اپنا مخصوص رنگ روپ رکھتی ہے اور اس کے نشو و نما کا قانون بھی مخصوص ہوتا ہے۔ لیکن ماہر نباتات اس تنوع اور کثرت کو انواع کے تحت میں لاکر مخصوص انواع کے مخصوص قوانین تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح حیوانات کا ماہر ان کے اقسام بناتا ہے اور ہر قسم کا ایک نام تجویز کرتا ہے۔ یہ نام کسی ایک فرد کا نام نہیں ہوتا بلکہ ایک نوع کا نام ہوتا ہے جس کے اندر لاتعداد افراد کچھ صفات کی مماثلت کی بدولت علم کے لحاظ سے ایک لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بھی علم کا یہی مفہوم ہے۔ آدم کے قصے میں تمام ملائکہ پر انسان کی فضیلت اسی بنا پر ثابت ہوئی کہ اس کو تمام اشیاء کے نام معلوم ہو گئے۔ بے شمار درختوں کو اس نے درخت کہا، طرح طرح کے چھوٹے بڑے پتھروں کو اس نے پتھر کہا۔ اسی کا نام عقل اور علم ہے۔ اور اسی راستے پر ترقی کرتے چلے جانا حکمت کی ترقی ہے۔ قرآن کا نظریہ اور اس کی تعلیم یہ ہے کہ یہ لامتناہی کثرت اور تغیرات کی کائنات ایک وحدت سے سرزد ہوئی ہے اور اس کو سمجھنے کا بھی لازمی طریقہ یہ ہے کہ انسان کہیں بھی کثرت کو کثرت محض نہ سمجھے بلکہ ہر قدم پر اس کو چھوٹی یا بڑی وحدتوں کی طرف لوٹاتا جائے یہاں تک کہ وہ ایک وحدتِ کلی تک پہنچ جائے جو اوّل بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ تمام علمی اور عملی کوششوں کا منتہٰی بھی خدا ہے، اور تمام حکمت کا مقصود بھی ہستی کی وحدت کا فہم ہے۔ قرآن جو خالص توحید کی تعلیم دیتا ہے وہ درحقیقت معرفت کائنات کا درس ہے۔ علم کی زبان میں جسے آئین یا قانون کہتے ہیں، قرآن کی زبان میں اس کو سنت اللہ کہا گیا ہے جس کے متعلق کئی جگہ دہرایا گیا ہے کہ تم اس میں کوئی تغیر یا تلوّن نہ پاؤ گے۔ خلاقِ کائنات اور ہادیِ وجود کی مشیت کچھ ثابت و قائم اصول رکھتی ہے۔ خدا کا یہ بنا

اور اس کا ارادہ انسانی خواہش اور ارادے کی طرح نہیں جو کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ آئینِ حیات کو قائم و دائم رکھنا خدا کا ایک وعدہ ہے اور خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا ان اللہ لا یخلف المیعاد۔ سائنس میں کسی نظریہ کی صداقت اسی سے جانچی جاتی ہے کہ اس کے مطابق جو پیش گوئی یا پیش بینی کی جائے، بعد میں آنے والے حوادث و مظاہر اس کی تصدیق کریں۔ گویا سائنس کا مدار بھی ان اللہ لا یخلف المیعاد ہی پر ہے۔ انسان کی فطرت ہو یا کائنات کے کسی شعبے کی فطرت سب کے متعلق قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لا تبدیل لخلق اللہ قرآن کے نزدیک اسی کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نام دین ہے اور اسی کی معرفت حکمت ہے۔ دنیا کے کسی مذہبی صحیفہ میں یہ تعلیم اس وضاحت کے ساتھ نہیں ملتی۔ دین کی ماہیت کو قرآن ہی نے ہمیشہ کے لیے واضح کیا ہے اور عقل و حکمت کے ساتھ اس کا لزوم بنایا ہے:

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ، ذالک دین القیم	اللہ کی اس فطرت کو دیکھو جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے قوانینِ خلق میں کوئی تبدیلی نہیں۔ یہی ہے دینِ قیم۔

قرآن نے پہلے انبیا کی نسبت بھی یہ فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو عقائد و اعمال کے فطری علل و اسباب اور نتائج سے بھی آگاہ کرتے تھے۔ محض حکم ہی نہیں سناتے تھے بلکہ اس کی حکمت بھی واضح کرتے تھے۔ پہلے انبیا کے احکام زمان و مکان اور مخصوص مزاج اقوام کے مطابق تھے۔ اسی لیے جو حکمت وہ پیش کرتے تھے وہ بھی محدود و مخصوص تھی۔ کلم الناس علی قدر عقولھم نبوت اور حکمت دونوں کے لیے لازمی قاعدہ ہے۔

آخر میں جب ابدی حقائق پیش کرنے والا عالمگیر دین آیا تو اس میں حکمت کا پہلو بھی تمام موجودات اور تمام عالمِ انسانی پر محیط ہو گیا۔ قرآن کے نزول کے بعد

دین اور حکمت کے دائرے الگ الگ نہیں رہے۔ بعض قسم کے فلسفوں اور دین میں تو تصادم ہو سکتا ہے، لیکن مظاہر فطرت میں آئین کی جستجو اور دین اسلام میں باہمی تضاد و تخالف کا کوئی امکان نہیں۔ قرآن مختلف سائنسوں کے جزئی اور مخصوص معلومات کی تعلیم نہیں دیتا۔ نہ وہ فلکیات کی کتاب ہے اور نہ طبیعیات و کیمیا و ریاضی کی کتاب، لیکن تمام سائنس کی بنیادوں کو قرآن نے استوار کر دیا ہے سائنس کی تمام اساس یہی ہے کہ مظاہر متغیر ہیں لیکن ان کے قوانین تغیر پذیر نہیں۔ کسی شعبۂ کائنات کا قانون کبھی کچھ اور کبھی کچھ ہو جائے تو یہ کائنات، کائنات نہ رہ سکے۔ جمادات، نباتات، حیوانات، اجرام فلکیہ بے آئینی سے قائم نہ رہ سکیں۔ بلکہ قیام کا تو کیا سوال ان کا وجود ہی سرے سے ناممکن ہو جائے۔ جو چیز عدم سے وجود میں آتی ہے وہ ایک خاص اندازے سے ظہور پذیر ہوتی ہے قرآن کہتا ہے کہ خدا کی قدرت اور اس کے خزانے لامتناہی ہیں۔ لیکن جو کچھ معرض وجود میں آتا ہے وہ ایک خاص اندازے اور تناسب کے ساتھ آتا ہے:

انا کل شیئ خلقنٰہ بقدر (۵۴: ۴۹) ہم نے ہر چیز کو ایک خاص اندازے سے پیدا کیا ہے۔

ہستی کی اسی ماہیت کو قرآن میزان بھی کہتا ہے:

اللہ الذی انزل الکتٰب بالحق و المیزان ... (۴۲: ۱۷) اللہ نے ٹھیک کتاب بھی اتاری اور میزان بھی

قدیم زمانے میں اکثر مذاہب کے معتقدین نے عقیدہ قائم کر لیا تھا کہ ہر قسم کی سائنس کے نظریات ان کے مذہبی صحیفے میں از روئے وحی درج ہیں، اس لیے کسی سائنس داں نے شجر و حجر اور شمس و قمر کے متعلق جو کچھ کہا اس کو اس نظر سے دیکھا گیا کہ وہ مذہبی صحیفہ میں بیان کردہ تعلیم کے مطابق ہے یا مخالف فلکیات کے بطلیموسی قیاسات کو دین کا جزو سمجھ لیا تھا۔ جب جدید تجرباتی سائنس نے ان کی تائید نہ کی تو گیلیلو جیسے محقق کو قابل تعزیر قرار دیا۔

یورپ میں مذہب اور سائنس کی کشاکش نے ضمائرِ انسانی کو بہت مضطرب کیا اور یہ اضطراب اب بھی باقی ہے۔ سائنس کا آغاز مسلمانوں کی تجرباتی تحقیقات سے ہوا لیکن کسی مسلمان مفکر کی ان کوششوں کو ملعون اور مردود قرار نہیں دیا گیا۔ فطرت کے مظاہر میں آزادانہ طور پر تحقیق و تدقیق سے آئین تلاش کرنا ایک بیّن حکم قرآنی تھا۔ لہذا دین اور سائنس کی باہمی جنگ نہ اسلام کی تاریخ میں پہلے نظر آتی ہے اور نہ اب اس کا امکان ہے سوا اس کے کہ اسلام اور قرآن ایسے جامد اور کوتاہ بین فقیہوں اور مفسروں کے ہاتھ میں آجائے جو مغرب کے عیسائیوں کی طرح سائنس کے جزئیات کو بھی قرآن و حدیث میں تلاش کرنے کی سعیِ لاحاصل کریں۔ قرآن نے حکیمانہ زاویۂ نگاہ پیدا کیا ہے جس سے ابدالآباد تک حکمت و معرفت کی راہیں کھل گئی ہیں۔ قرآن میں اگر شجر و حجر یا شمس و قمر یا برق و باراں کسی بیان میں ملتے ہیں تو اس کا مقصد کسی طبیعی سائنس کے جزئی نظریات کو پیش کرنا نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت اور اسلوبِ بیان سے مقصودِ حیات کو واضح کرنا ہے۔ تشبیہات و تمثیلات کسی سائنس کے آئین و قوانین نہیں ہوتے۔ فطرت کے مظاہر کی بہت سی چیزیں زبان کے عام محاورات میں داخل ہو جاتی ہیں، اور فصاحت کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ ان کو دل کش انداز میں اپنے بیان میں سموئے۔ اکثر ہادیانِ دین نے روحانی حقائق کو تمثیلات اور تشبیہات میں پیش کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خالی منطقی استدلال عام انسانی طبائع کے لیے اتنا دل نشین اور اثر آفریں نہیں ہوتا جتنا کہ مثال اور تشبیہ۔ قرآن کہتا ہے کہ تشبیہ و تمثیل کی ماہیت فقط راسخ العلم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ کوتاہ نظر اور فتنہ انگیز لوگ الفاظ و صور میں الجھ جاتے ہیں۔ قرآن نے نہایت حکیمانہ انداز میں محکمات کو متشابہات سے الگ کر دیا ہے۔ دین کا لازمی جزو محکمات ہیں یعنی وہ محکم حقائق جو فطرت کے مطابق ہونے کی وجہ سے اٹل ہیں۔ خود جنت کے نہایت دل کش بیانات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ جنت کی مثال ایسی ہے

جیسے کہ کوئی باغ ہو:

مثل الجنۃ التی وعد المتقون فیھا انھر من ماء غیر اسن ..... (۴۷ : ۱۵)

جس جنّت کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے اس میں نہ خراب ہونے والے پانی کی نہریں ہوں .....

اسی طرح دوزخ کے متعلق فرمایا کہ اس کے شعلے دلوں میں سے اٹھتے ہیں تاکہ سمجھنے والے سمجھ جائیں کہ وہ لکڑی یا کوئلہ جلانے والی بھٹی نہیں ہے:

نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ (۱۰۴ : ۶ و ۷)

اللہ کی وہ سلگائی ہوئی آگ جو دلوں پہ سے اٹھتی ہے۔

قرآن میں بعض جگہ فقط احکام ملتے ہیں جن کے ساتھ ہی ان کی حکمت کو بیان نہیں کیا جاتا لیکن کہیں کہیں آئین سازی کے اصول کو بھی بیان کر دیا ہے۔ مثلاً شراب اور قمار بازی کے متعلق نہایت اچھا استقرار کیا ہے۔ اور ان اعمالِ شیاطین کی ممانعت کا سبب بتا دیا ہے۔ کوئی قاعدہ یا قانون ایسا نہیں جو ہر حالت میں ہر شخص کو نفع یا نقصان پہنچائے۔ کوئی بھی طریق کار ہو اس میں بعض لوگوں کو بعض حالات میں کچھ فائدہ پہنچ جائے گا اور بعض کو نقصان۔ انسانی فطرت اور معاشرت کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ایسا ہونا لازمی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان اعمال سے بعض اوقات بعض لوگوں کو کچھ فائدے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن تمام انسانی معاشرت اور نفسیات پر پھیلا کر دیکھو اور اجتماعی نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ لو تو ان کے نقصانات ان کے منافع سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ قانون اکثریت کی بنا پر بنتا ہے۔ اس میں چند افراد کا نفع یا ضرر نہیں دیکھا جاتا۔ حکمتِ قرآنی نے یہ بتا دیا کہ قانون کی بنا افادیتِ عامہ ہے۔

انگلستان کے اکثر قوانین بنتھم اور مل کے زمانے تک نہایت مہمل اور عامۂ خلائق کو نقصان پہنچانے والے تھے۔ ان مضر قوانین کا ماخذ کچھ مذہبی تھا اور کچھ انگلستان کا قدیم روایتی قانون۔ ان قوانین میں نہ کوئی عدل نظر آتا تھا

اور نہ کوئی حکمت۔ اس لیے ان مصلحین اور مفکرین نے شدید جدوجہد کی کہ حکومت کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ قانون کی بنا افادیت پر ہونی چاہیے۔ قانون انسان کے لیے بنا ہے انسان ہر فرسودہ اور مہمل قانون کی پابندی کے لیے نہیں بنا۔ رفتہ رفتہ اس جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ قوم کے اکابر نے حکیمانہ اور عادلانہ انداز میں سوچنا شروع کیا اور لغو قوانین کو منسوخ کر دیا۔ اگرچہ اب بھی شادی اور طلاق اور وراثت کے متعلق کئی لغو قوانین موجود ہیں جو اصلاح طلب ہیں۔ انگلستان کے قدیم قانونِ وراثت میں وصیت کرنے والا ہر وارث کو مطلقاً محروم کر سکتا تھا۔ اور ہر نکاح کرنے والی عورت کی تمام جائداد اور تمام سرمایہ شوہر کے نام منتقل ہو جاتا تھا۔ عورت کی انفرادی حریت اور شخصیت بالکل سوخت ہو جاتی تھی۔ قرآنی احکام اور حکمت سے ان قوانین کا مقابلہ کر کے دیکھیے تو واضح ہو جائے گا کہ قرآن نے نوعِ انسان پر کتنا احسان کیا ہے اور کمزوروں کی کس قدر حمایت کی ہے۔

قرآن نے انسان کو حکمت پسند بنانے کے لیے ایک اور اہم قدم اٹھایا اسلام سے قبل کے تمام مذاہب نے اپنی بنیاد معجزات یا خوارق عادت پر قائم کی تھی اور انسانوں کی یہ عادت راسخ ہو گئی تھی کہ ہر نبی سے یہ تقاضا کیا جائے کہ وہ اپنی صداقت کے ثبوت میں کچھ معجزات دکھائے۔ یہ مطالبہ کفارِ قریش بار بار رسولِ کریم سے کرتے تھے۔ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ تم سے پہلوں میں معجزات نے کونسا ایمان پیدا کیا کہ اب پھر وہی تجربہ تمھارے ساتھ دہرایا جائے۔ خوارقِ عادت کے مطالبے کے جواب میں قرآن بار بار مناظرِ فطرت کو پیش کرتا ہے اور فطرت کے مشاہدے سے فاطرِ فطرت پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے۔ تمھارے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے خواہ وہ مٹی سے گلہائے رنگا رنگ اور اثمارِ گوناگوں کی پیدائش ہو، یا اجرامِ فلکیہ کا حساب سے گردش کرنا، سب معجزات ہی ہیں۔ ان معنوں میں نہیں کہ وہ خوارقِ عادت

ہیں۔ بلکہ خدا کی رحمت اور اس کی حکمت کے غیر متبدل مظاہر ہیں۔ انسان ایک طرف ان کی آفرینش سے عاجز ہے کہ ایک مکھی کا پر بھی نہیں بنا سکتا۔ دوسری طرف عجز یہ ہے کہ ایک پتے اور ایک ذرے کی ماہیت کو بھی کما حقہ نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی واقعہ انسان کے لیے خرقِ عادت ہو تو خدا کے لیے تو خرقِ عادت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ خدا کہتا ہے کہ میں اپنی عادت یا سنت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ جس کو انسان معجزہ سمجھتا ہے وہ بھی خدا کے کسی آئین کے ماتحت ظہور میں آتا ہے۔ بقول عارفِ رومی ع۔

هست بر اسباب اسبابے دگر

مردِ حکیم پر جس قدر ہستی کے آئین واضح ہوتے جاتے ہیں اسی قدر وہ پُراسرار بنتی جاتی ہے اس لیے کہ ہر وجود کے اندر اور باہر لا متناہی ہے۔ اس مضمون کا عرفی کا ایک نہایت حکیمانہ شعر ہے:

هر کس نشناسندۂ راز است وگرنہ　　　　ایں ہا ہمہ راز است کہ معلومِ عوام است

روس کے مشہور ادیب اور عارف ٹالسٹائی نے بھی کیا خوب کہا ہے کہ کلیسائی عیسائیت باری تعالیٰ کے ثبوت میں یہ معجزہ پیش کرتی ہے کہ مسیحؑ بغیر باپ کے پیدا ہوا مگر میں تو خدا کا اس مسلسل معجزے کی وجہ سے قائل ہوں کہ ماں اور باپ دونوں سے کس محیر العقول طریقے سے ہر روز نئے انسان معرض وجود میں آتے ہیں۔ دیکھیے ایک عیسائی عارف و حکیم کیسے اپنی بصیرت سے وہی بات کہہ رہا ہے جو تیرہ سو برس قبل قرآن نے کہی تھی کہ خدا کو خرقِ عادات میں مت ڈھونڈو بلکہ اس کی قائم کردہ سنت اور عادت میں تلاش کرو۔ رسول کریمؐ کے مستند سوانح میں کوئی صحابی ایسا نظر نہیں آتا جو کسی خرقِ عادت یا معجزے کی وجہ سے خدا اور رسولؐ پر ایمان لایا ہو۔ جو کوئی بھی ایمان لایا وہ رسول کریمؐ کی سیرت، ان کی راست بازی اور ان کی تعلیمات کی خوبیوں سے متاثر ہو کر جاں نثاروں کے گروہ میں شریک ہوا۔ بعض صحابیوں نے بعض مواقع پر

ایسی باتیں دیکھیں جو عالمِ اسباب کے حدود علم میں رہتے ہوئے ان کے لیے حیرت انگیز تھیں لیکن ان کے ایمان لانے کا موجب نہ تھیں۔ قرآن نے فیصلہ کر دیا کہ جو کوئی بھی ایمان کے نور سے منور ہونا چاہے وہ اسلامی تعلیمات کی خوبی کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہو۔ اسلام نے دین کا رخ معجزات سے فطرتِ عامہ کی طرف اور خوارقِ عادت سے حکمت طلبی کی طرف پھیر دیا۔ یہ نوعِ انسان کے ارتقا میں ایک بہت اہم قدم تھا۔

کوئی تین سال قبل میں نے امریکہ میں ایک یونیورسٹی میں اسلام کے بنیادی عقائد پر ایک لیکچر دیا اور بتایا کہ قرآنی وحی میں فطرت اور حکمت کا کیا تصور ہے۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ ڈاکٹر مرفی نے مجھ سے کہا کاش کہ ہمارے ہاں بھی دین کا یہ تصور ہوتا تاکہ ہم سائنس اور مذہب کی اس شدید کشاکش سے بچ جاتے جس نے ہمارے نفوس اور عقائد میں ایک پیکار بپا کر رکھی ہے۔ دین میں ہم خوارقِ عادت کو اساس قرار دیتے ہیں اور باقی تمام سائنس اور دیگر تعلیم میں فطرت کی آزادانہ تحقیق کا درس دیتے ہیں۔

اب ایک اہم سوال کا جواب باقی رہ جاتا ہے کہ جب خدا کی کتاب، کتابِ حکمت ہے تو قرآن کتاب کے علاوہ حکمت کا کیوں ذکر کرتا ہے۔ نبی کریمؐ کو حکم ہے کہ تم لوگوں کو اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ خدا اس کے تین طریقے بتاتا ہے ایک حکمت، دوسرا موعظت، تیسرا مباحثہ، مناظرہ یا مجادلہ۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ	اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ
والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم	وعظ کے ذریعے دعوت دو اور بہترین طریقے
بالتی ھی احسن ط ..... (۱۶ : ۲۵)	سے مباحثہ کرو۔

اس میں قرآن کا مقصد انسانوں کی تین قسمیں بتانا ہے اور ہر قسم کو دعوت دینے کا طریقہ الگ ہے۔ بعض انسان، اگرچہ ان کی تعداد بہت قلیل ہے، حکمت پسند ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے اگر کوئی عقیدہ یا طریقِ عمل پیش کیا

جائے تو وہ اس کے علل و اسباب کو جاننا چاہتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ اس بات پر کیوں یقین کیا جاتا ہے یا اس عمل میں جس کی تلقین کی جاتی ہے کیا خوبی ہے اور جس عمل سے روکا جاتا ہے اس میں کیا برائی ہے۔ جب تک کسی علم کی علت ان کی سمجھ میں نہ آئے وہ اس پر عمل کرنا گوارا نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ بس یہ خدا کا حکم ہے۔ حکمت پسند شخص جب تک حکم کی ضرورت اور اس کے نتائج سے آگاہ نہ ہو فرماں برداری پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ عربوں میں علوم و فنون نہ تھے اور کتابی علم نہ تھا لیکن ان میں ایک تعداد ایسے انسانوں کی تھی جن میں غیر معمولی خداداد ذہانت تھی۔ اگر یہ فطری صلاحیت موجود نہ ہوتی تو وہ بعد میں نظم و نسقِ حکومت اور تعمیر و اصلاحِ ملت کے لیے ایسے حیرت انگیز کام نہ کر سکتے جن کی بدولت ایک عادلانہ معاشرہ اور عظیم الشان تہذیب و تمدن قائم ہوا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اسلام کے احکام کو معقول سمجھ کر اس دین میں داخل ہوئے۔ افسوس ہے کہ موجودہ دورِ انحطاط میں ایسے خود ساختہ ہادیانِ دین پائے جاتے ہیں کہ جب ان سے شریعت کے کسی حکم کی علت دریافت کی جائے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ دین کے احکام میں علت تلاش کرنا ضروری نہیں اور دین کا تقاضا یہ بتاتے ہیں کہ ہر حکم پر بے چون و چرا ایمان لایا جائے۔ عصرِ حاضر عقلیت اور حکمت کا دور ہے۔ جہلا کو تو بے سمجھے دین کی پابندی کی تلقین کر سکتے ہیں لیکن علوم سے بہرہ ور لوگ جنھیں سوچنے کی عادت ہے وہ ایسا جواب پا کر دین کی ضرورت ہی پر شک کرنے لگتے ہیں۔ اب تعلیم یافتہ طبقے کو حکمت ہی کے راستے سے دین کا قائل کیا جا سکتا ہے لیکن بہت سے مدعیانِ دین خود حکمت کے جوہر سے معرا ہیں۔

نبی کریمؐ کو ایک دوسرے گروہ سے دوسرا طریقہ برتنے کو کہا گیا۔ یہ طبقہ وہ ہے جس میں حکمت طلبی کا عنصر کم ہوتا ہے۔ اس طبقے کے لیے وعظ و پند و نصائح اصلاحِ سیرت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ حکمت پسند طبقے کے مقابلے میں اس گروہ

کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے لیکن موعظت بھی اسی واعظ کی مؤثر ہو سکتی ہے جس میں خود اخلاص عمل ہو۔ جس کا قول اس کے فعل کے مطابق ہو۔ ورنہ یقولون ما لا یفعلون کے گروہ کے متعلق وہ بات صحیح ہے جو حافظ علیہ الرحمہ کہہ گئے ہیں:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند — چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمندِ محفل باز پرس — توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

یہ یقینی بات ہے کہ اسلام میں بہت سے لوگ نبی کریمؐ کی موعظت کی وجہ سے داخل ہوئے۔ جو نصیحت کی جاتی تھی رسولؐ کی زندگی خود اس کا ایک نمونہ ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ زندہ مثال کا اثر خالی نصیحت سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن نصیحت اور ناصح کی زندگی اگر ایک دوسرے کا آئینہ ہوں تو اثر میں بہت گہرائی اور گیرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ رسولؐ کی نصیحتیں اب بھی تقریر و تحریر میں صبح و شام دہرائی جاتی ہیں لیکن کسی کی زندگی پر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لیے کہ کہنے والے کے کردار و گفتار میں ایک وسیع خلیج حائل ہوتی ہے۔

تیسرا گروہ مناظرہ بازوں کا ہے جو اپنی بات منوانے اور دوسرے کی بات کو رد کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ یہ نہ حکمت پسند ہوتے ہیں اور نہ پند پذیر۔ ہر مخلص مصلح کو ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ کسی اہم دینی مسئلے پر بحث کرنے سے کوئی نبی کیسے انکار کر سکتا ہے۔ لیکن نبی کا کام یہ ہے کہ ہر طبقے کے لیے ایک اچھی مثال پیش کرے۔ نبی کو حکم دیا گیا کہ ان سے بحث کر لیکن خوبصورت طریقے سے۔ کسی مناظرے میں اخلاص و صداقت کو ہاتھ سے نہ دینا، دل آزار پیرایہ کا جواب حلم اور نرمی سے دینا۔ خواہ مخواہ دوسرے کو گرانے اور ہرانے کی کوشش نہ کرنا غیر معمولی صالح نفوس کا کام ہے۔ اس کام کو ایک پاکیزہ نفس اور حکیمانہ مزاج رکھنے والا رحیم و کریم نبی ہی انجام دے سکتا ہے۔ عام انسانوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص دکھائی دے جو مذہبی بحث میں واقعی طالبِ حق ہو اور مہذب طریقے سے دوسرے

کی سُنے اور اپنی سنائیے، اور جہاں حریف سچ بات کہہ رہا ہو، اس کی صمیم قلب سے داد دے۔ رسول کریمؐ نے جو لوگوں سے بحثیں کی ہیں اُن کو سامنے رکھ کر دیکھیے کہ ان کا اندازِ بحث سلجھا ہوا ہے۔ محض شخصی اور الزامی گفتگو کہیں نہ ملے گی۔

کتاب و حکمت کے متعلق بعض فقہا کا خیال ہے کہ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنّتِ رسولؐ ہے۔ اس میں کسی قدر صداقت ضرور ہے، لیکن یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔ سنّتِ رسول کریمؐ کا عمل ہے جو قرآنی تعلیم کی عملی صورت ہے۔ خیالی بلند افکار نے دنیا میں کبھی انقلاب پیدا نہیں کیا جب تک کہ ان افکار کو عملی جامہ پہنانے والے دنیا کے سامنے نہ آئے۔ اگر رسولؐ خود اپنے عمل میں قرآن مجسم نہ ہوتے تو محض خدا کی کتاب کوئی انقلاب پیدا نہ کر سکتی۔ دنیا میں اسلام کی بدولت جو اصلاحی انقلاب ہوا وہ قرآن اور سیرتِ محمدؐ نے مل کر پیدا کیا۔ قرآن پر عمل کرنے سے زندگی کیا بن سکتی ہے اس کا مظاہرہ رسولؐ کے اسوۂ حسنہ ہی سے ہوا۔ لیکن قرآن جب کتاب اور حکمت کہتا ہے تو اس میں حکمت محض سنت کے مرادف نہیں ہے۔ اگر یوں سمجھا جائے تو اس سے یہ ایک غلط نتیجہ نکلتا ہے کہ خود کتاب میں حکمت نہیں ہے۔ قرآن تو خدا کو حکیم اور اپنے آپ کو حکمت کی کتاب قرار دیتا ہے۔ یہ صحیح معنی یہ ہوں گے کہ نبی خدا کی کتاب کو پیش کرتا ہے، اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے۔ مگر اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کتاب کے اندر جو حکمت ہے اس کو سننے والوں پر واضح کرتا ہے۔ اگر وہ مخاطب پر کھول کر اس کی حکمت واضح نہ کرے تو شاید وہ حکمت پنہاں رہ جائے۔ اس وقت دنیا میں ہر علم و فن میں مستند اساتذہ کی تصنیف کردہ کتابیں موجود ہیں۔ یونیورسٹیوں کے طالب علم ان کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اعلیٰ درجے کے پروفیسروں سے انھیں کتابوں کے پڑھنے کے بغیر چارہ نہیں۔ جن طالب علموں نے اعلیٰ درجے کے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا ان کے اندر محض اچھی کتابیں پڑھنے کے باوجود

ایک کمی رہ جاتی ہے۔ حکمت کتاب میں موجود ہوتی ہے لیکن استاد کی توضیح اس کو اجاگر کرتی اور کتاب کے ہر گوشے کو منور کر دیتی ہے۔ محض طب کی کتابیں پڑھنے سے کوئی طبیب حاذق نہیں بن سکتا جب تک کہ تجربہ کار اطبا سے اس نے کسبِ فیض نہ کیا ہو۔

کتاب و حکمت بیں حکمت، قرآن حکیم ہی کی حکمت ہے جس کو بطون سے ظہور میں لانا اور حکم کو عمل کا جامہ پہنانا نبی کا وظیفہ ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ حکمت کوئی ایسی سنت نہیں جو قرآن سے الگ ہو، یا اس میں کوئی اضافہ کرتی ہو۔ قرآن کے اندر کہیں احکام ہیں اور کہیں حکمت کے اصول ہیں۔ یہی حکمت کے اصول اصل دین ہیں، جو احکام کی اساس ہیں اور جن کی بنا پر متغیر حالات اور نئے ماحول میں نئے احکام کا استنباط ہو سکتا ہے۔ خود رسول کریمؐ نے اپنی زندگی میں اور اس کے بعد خلفائے راشدین اور ان کے بعد ائمۂ مجتہدین نے ایسا ہی کیا۔

(ثقافت، اپریل ۱۹۵۵ء)

اسلام اور آزادیٔ فکر

اسلام نے عالم انسانی میں کئی نظریاتی اور عملی انقلابات پیدا کیے۔ لیکن اگر طلوعِ اسلام کی معاصر تہذیبوں، تمدنوں اور مذاہب کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر بلا خوف تردید نمایاں ہو جاتا ہے کہ سب سے اہم انقلابی بات جو اسلام نے کی وہ آزادیٔ ضمیر کی تلقین اور اس پر عمل تھا قرآن کریم میں انسان کی فطرت کے متعلق ایک اساسی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک صاحبِ اختیار ہستی ہے۔ آدم کے عالمِ شہود میں آنے سے پیشتر جمادی، نباتی اور حیوانی کائنات موجود تھی اور فرشتے بھی ابتدائے آفرینش سے نظمِ کائنات میں خدائے خلاق کے نمائندے اور کارندے تھے۔ لیکن ملائکہ سمیت تمام مخلوقات کی کیفیت یہ تھی کہ ہر مخلوق ازروئے فطرت اطاعت پر مجبور تھی، اس جبر سے وہ کوئی تنگی محسوس نہ کرتی تھی۔ ہر چیز اپنی فطرت کا تقاضا پورا کر رہی تھی، اور اپنی فطرت کا تقاضا پورا کرنے میں جس قسم کا جبر پایا جاتا ہے وہ مکروہ محسوس نہیں ہوتا۔ آدم کی آفرینش کے وقت خدائے خلاق و حکیم نے ایک نیا تجربہ کرنا چاہا اور وہ یہ کہ ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا جائے جسے نیکی اور بدی دونوں کے راستے دکھائے جائیں اور اسے اختیار دیا جائے کہ ان راستوں میں سے جو چاہے اسے اختیار کرے، اسے ازروئے وحی اور ازروئے تجربہ یہ علم دیا جائے کہ ان متضاد راستوں پر چلنے کے نتائج کیا ہوں گے لیکن اس کے ارادوں پر کوئی جبر نہ ہو۔ اگر یہ مخلوق جسے احسنِ تقویم ہونے کے باوجود اختیارِ گناہ بھی دیا گیا ہے، اپنی مرضی سے وہ راستہ اختیار کرے جو مشیتِ الٰہی کے مطابق ہے تو وہ کائنات میں سب سے اعلیٰ اور اشرف ہو جائے اور اگر صلاحیتوں اور علم کے باوجود

وہ غلط راستے کو ترجیح دے تو وہ تمام موجودات کے مقابلے میں ادنیٰ ہو کر اسفل السافلین بن جائے۔ کسی شاعر کا مشہور قطعہ ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ "آدمی زادہ فرشتگی اور حیوانیت کی ایک عجیب معجون مرکب ہے۔ اس میں دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ ملکوتی میلان کو ترقی دے تو فرشتوں سے فائق ہو جائے اور حیوانیت کی طرف راجح ہو تو کالانعام بل ھم اضل ہو کر تمام حیوانوں کے مقابلے میں زیادہ ذلیل اور گمراہ ہو جائے:

آدمی زادہ طرفہ معجونیست　　از فرشتہ سرشتہ وز حیواں
گر کند میل ایں شود بد ازیں　　ور کند قصد آں شود بہ ازاں

اس قطعے میں یہ مضمون مضمر ہے کہ ان دو عناصر کے علاوہ انسان کو ایک تیسرا ملکہ ودیعت کیا گیا جسے اختیار کہتے ہیں، اس کی بلندی اور پستی کا معیار اسی آزادی کے صحیح یا غلط استعمال پر ہے۔ آدم کے قصے میں اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ اس نے اس اختیار کے جوہر کا اولاً غلط استعمال کیا اور اس سے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ تمام دیگر مخلوقات سے جو مجبور اور مطیع ہیں، کوئی دوسری قسم کی مخلوق ہے۔ آزادی ہی کا عملی ثبوت مہیا ہونے سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے۔ خواہ ناتجربہ کار انسان اول قدم میں ڈگمگا ہی کیوں نہ جائے۔ خدا نے دیکھا کہ مخلوقات کی اطاعت جبری میں وہ لطف نہیں جو اس بندے کی اطاعت میں ہے، جسے خلاف ورزی کا اختیار تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی مرضی سے اطاعت کی، صراطِ مستقیم کو راہِ نجات سمجھا، اور اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کا ہم آہنگ بنا دیا اور اسی اتحاد کی وجہ سے اس کو الوہیت کا وہ قرب حاصل ہوا جو جلیل القدر ملائکہ کو بھی نصیب نہ تھا۔ خدا نے کہا کہ اب ہم کائنات کو محض غلاموں کی بستی دیکھنا نہیں چاہتے۔ خدا خود آزاد ہے، اس نے چاہا کہ وہ اب اپنی ہم آہنگ مخلوق پیدا کرے جو اختیار اور آزادی کے ساتھ اپنی خودی کو خدا کے سپرد کر دے اور اپنے تئیں "من تو شدم تو من شدی"

کی معراج پر پہنچا سکے۔ قصۂ آدم میں ہبوط و عروج کی داستان کے اندر اسلام کی تمام تعلیم کا جوہر موجود ہے۔ اپنے اختیار سے ٹھوکر کھا کر سنبھلا ہوا انسان رفتہ رفتہ نیابتِ الٰہی اور خلافتِ ارضی کے رتبے تک پہنچ سکتا ہے اسی لیے اس دین نے سب سے زیادہ آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ فکر اور آزادیٔ عمل کو مذہب اور تہذیب کی بنیاد قرار دیا ہے۔ انسان صداقتوں کے راستے ٹٹولنے والی مخلوق ہے اور اگر اس جستجو میں آزادی نہ ہو، اور غلطی کرنے کا امکان نہ ہو تو انسان اور جمادات میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ دین سب سے پہلے نیکی کی تلقین کا نام ہے لیکن جو نیکی جبر سے پیدا کی جائے وہ اخلاقاً نیکی میں شمار نہیں ہوتی۔ ایسی جبری نیکی کے لیے کون کسی کو قابلِ ستائش اور مستحقِ اجر سمجھتا ہے، اور ایسے شخص کے دین کی کیا قیمت ہے جسے بزورِ شمشیر یا بخوفِ تحقیر و تشہیر کسی عقیدے کے اقرار پر مجبور کیا گیا ہو۔ اس جبر سے تو اس کی انسانیت کا جوہر ہی ملیا میٹ ہو جائے گا، حالانکہ دین کا کام اس جوہر کو اجاگر کرنا ہے۔ ایک مغربی مستشرق نے لکھا ہے کہ قرآن کی تعلیم میں سب سے زیادہ شاندار چیز لا اکراہ فی الدین کا اعلان ہے کہ دین کے معاملے میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں۔ رسول کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی اور اسلام کے قیام و استحکام کی خاطر ان کی جدوجہد میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی شخص کو بزورِ شمشیر قبولِ اسلام پر مجبور کیا گیا ہو۔ کفار سے جنگیں اس لیے نہیں لڑی گئیں کہ ان کو مغلوب کر کے بجبر مسلمان کیا جائے بلکہ ان جنگوں کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو آزادیٔ ضمیر کے انسانی اور اساسی حق سے محروم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے محض ان کے دین کی وجہ سے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ از روئے قرآن قتال و جہاد صرف اسی گروہ کے خلاف نہ جائز بلکہ فرض ہے جو انسانوں کو آزادیٔ ضمیر سے محروم کر کے ان کو اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے میں مزاحم ہو۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق نہایت وضاحت سے کہا ہے کہ اگر خدا ایسی ظالم اور جابر قوموں کے

خلاف حریت کے علم برداروں کو قتال و جہاد کے لیے کھڑا نہ کرتا تو دیر و کنشت کلیسا و مساجد دنیا کے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے۔ اس آیت کریمہ کے اندر جو وسعت مشرب اور تمام مذاہب کے لیے جو آزادی کا اعلان ہے اس پر غور کرو کہ خدا ہر ایسے گروہ کو تباہ کرنے کے لیے مجاہدین کو کھڑا کرتا ہے جو صرف اسلام ہی کی حفاظت کے لیے جان و مال کی بازی نہیں لگاتے بلکہ تمام مذاہب میں آزادیٔ ضمیر کو کچلنے والے جہاں بھی ابھریں ان کو مغلوب کرنا انسانیت کا فرض ہے۔ اس آیہ کریمہ میں مساجد کا ذکر اور تمام ادیان کے معبدوں کی حفاظت کے بعد کیا گیا ہے تاکہ مسلمان یہ نہ سمجھ لیں کہ فقط اپنے مذہب کے معاملے میں ہی آزادیٔ ضمیر کے لیے جہاد فرض ہے۔ اس تعلیم کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ جب اسلامی جماعت اور مملکت محفوظ و مصئون ہو گئی تو ہر ملت کو آزادیٔ ضمیر کا چارٹر عطا کر دیا گیا۔ عیسائیوں کو عطا کردہ یہ چارٹر اب بھی اپنے اصل الفاظ کے ساتھ فرامین حضرت عمرؓ میں محفوظ ہے۔ یہ طریق فکر و عمل رسول کریمؐ کی مثال سے شروع ہوا کہ مدینے میں اپنے ورود مسعود کے ساتھ ہی وہاں کے یہود کو یہ چارٹر عطا کیا گیا کہ اگر تم قیام امن میں ہمارے ساتھ تعاون برتو، تو تمہیں اپنے مذہب اور طریق زندگی کے متعلق تمام وہ حقوق حاصل ہوں گے جو مومنین کی جماعت کو حاصل ہیں۔ اس کے بعد جب یہود مدینہ نے اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں عملی جد و جہد شروع کر دی اور اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کا آغاز کیا تو ان کے خلاف جنگ کر کے ان کو مطیع کرنا پڑا۔ لیکن کسی یہودی کو بجبر مسلمان نہیں کیا گیا۔

قرآن کریم میں مشاہدۂ فطرت اور تفکر و تدبر کی تلقین اس قدر تاکید کے ساتھ ملتی ہے کہ اس کی مثال اور مذہبی صحیفوں میں نایاب ہے۔ حیات و کائنات لامحدود ہیں، اور ان کے مظاہر کے ساتھ ان آئینوں اور قانونوں کا بھی کوئی شمار نہیں جو قرآن کی اصطلاح میں کلمات الٰہی کہلاتے ہیں۔ تمام سمندر

اور ان سے بھی زیادہ قلزم اگر لکھنے کی روشنائی بن جائیں تو یہ سب خشک اور ختم ہو جائیں، پیشتر اس کے کہ کلمات کا بیان ختم ہو۔ اس تلقین کے مطابق انسان کی تمام عمر اور اس کا ہر لمحہ انفس و آفاق کے آئین و قوانین کی جستجو میں صرف ہونا چاہیے۔ عبادت کا وسیع ترین مفہوم یہی تفکر ہے۔ اگر آزادیٔ فکر نہ ہو تو یہ عبادت کیسے ادا ہو سکتی ہے۔ تفکر کی ماہیت ہی میں آزادی سے سوچنا داخل ہے۔ آزادیٔ فکر سے اسلام اس لیے گھبراتا یا خوف زدہ نہیں ہوتا کہ اسے یہ یقین کامل ہے کہ فکرِ آزاد ضرور ہزار دفعہ بھٹکنے کے باوجود بھی انسان کو زندگی کی صداقتوں سے آشنا کر سکتی ہے۔

مسلمانوں کی سلطنتوں میں شروع ہی سے غیر مسلم کثیر یا قلیل تعداد میں آباد رہے ہیں۔ کبھی کسی مسلمان حکمران نے ان کی آزادیٔ ضمیر کو نہیں کچلا۔ مملکت سے وفاداری اور عامۃ المسلمین کے ساتھ دوش بدوش امن و امان کی زندگی بسر کرنے کے علاوہ اور کوئی تقاضا ان سے کبھی نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے بعض وسیع خطوں پر صدیوں کی حکمرانی کے باوجود مسلمان اقلیت میں رہے، اور آخر میں ان کو رواداری کی یہ سزا بھگتنی پڑی کہ جب غیر مسلموں کو سیاسی یا عسکری غلبہ حاصل ہوا تو ان احسان ناشناسوں نے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور ان کو فقط دو متبادل صورتیں پیش کیں کہ اپنا دین بجبر بدل لو اور یا یک بینی و دو گوش باہر ہو جاؤ۔

یہ تو اسلام کی تعلیم اور مسلمانوں کے رویہ کا ایک روشن پہلو ہے جس نے انسانی تہذیب میں ایک گراں قدر عنصر کو داخل کیا، لیکن اس امر کا افسوس کے ساتھ ذکر کرنا پڑتا ہے کہ خلافت کے مملکت میں تبدیل ہونے کے بعد بعض سلاطین کی کج اندیشی اور مرورِ ایام سے اسلام میں پیدا ہونے والے فرقوں نے اسلام کے اس سبق کو فراموش کر دیا۔ غیر مسلموں سے تو کوئی تعرض نہ کیا کہ وہ اپنے افکار و عقائد میں ہر طرح آزاد رہیں لیکن مسلموں نے مسلموں کے ساتھ

رواداری کو بالائے طاق رکھ دیا۔ مطلق العنان سلاطین نے سیاست کے معاملے میں عامۃ المسلمین کو بے دخل کر دیا اور مذہبی فرقوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر کے دوسروں کے لیے آزادیٔ افکار و گفتار کو ممنوع قرار دیا۔ چھوٹے چھوٹے فروعی اور فقہی اختلافات پر ایک دوسرے کی جان کے لاگو ہو گئے۔ کہیں شیعہ سنی کے جھگڑوں میں، کہیں جبر و اختیار کی بحث میں، کہیں ذات و صفاتِ الٰہیہ یا خلقِ قرآن کے عقیدے کی بابت ناموافق رائے رکھنے والوں کے خلاف آمادۂ آزار و پیکار ہو گئے۔ ذرا ذرا سی بات پر تکفیر کے حربے استعمال ہونے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جو دنیا کو آزادیٔ ضمیر کا پیام پہنچانے پر مامور ہوئے تھے، سب دنیا سے زیادہ متعصب شمار ہونے لگے۔ ملتِ اسلامیہ کے انحطاط کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن ایک بڑا سبب آزادیٔ فکر کا فقدان ہے۔ مذہبی تعصب کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے۔ مشرقی تہذیب کا انداز یہ ہے کہ اس کے اندر ہر چیز دین کے احاطے میں آجاتی ہے۔ کھانا، پہننا، اٹھنا، بیٹھنا، علوم و فنون، طبیعیات، کیمیا، علم الافلاک، معیشت، سیاست، سب مسلّمہ عقائد کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور ان میں سے کسی چیز میں زاویۂ نگاہ یا طریقِ فکر و عمل کا اختلاف ایک اساسی دینی اختلاف بن جاتا ہے۔ جس کے بعد دو مخالفوں کا مل بیٹھنا یا مل کر خدا کے سامنے سجدہ کرنا بھی حرام ہو جاتا ہے۔ ایسی ملتیں جاہل، پسماندہ اور مغلوب ہو جاتی ہیں۔ عالمِ انسانی میں ترقی تحقیق سے ہوتی ہے اور جمود کو دانہ تقلید سے پیدا ہوتا ہے۔ جس زمانے میں مسلمان تہذیب و تمدن میں اپنی معاصر دنیا سے کوسوں آگے تھے، اس زمانے میں تحقیق تقلید پر غالب تھی۔ باقی دنیا کی پس ماندگی کی وجہ یہ تھی کہ اور کسی جگہ مذہب اور علوم و فنون کے بارے میں آزادیٔ فکر نہ تھی۔ مغرب میں کلیسا کے استبداد نے مغربی زندگی کے ایک ہزار سال کو ازمنۂ مظلمہ بنا دیا اور تجدید کلیسا کی تحریک کے بعد مذہبی جنگوں نے مغربی تہذیب کے پرخچے اڑا دیے۔ اٹھارویں صدی میں اس تعصب کی

خانہ بربادی کے خلاف زور و شور سے ردِ عمل شروع ہوا اور چونکہ سب تباہی مذہب کے نام پر ہوتی تھی اس لیے مصلحین اس نتیجے پر پہنچے کہ ریاست کو مذہب سے الگ کر دیا جائے۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ اسلام زندگی کے کسی شعبے کو مذہب سے الگ کرنے کا قائل نہیں ہے۔ لیکن اگر تنگ نظری، عدمِ رواداری اور تقلیدِ محض میں لکیر کا فقیر بننے کا نام اسلام ہو جائے تو خطرہ یہ ہے کہ اصلاح پسند اور امن پسند لوگ اسلامی ملکوں میں بھی دین کو سیاست سے الگ کرنے کی فکر کرنے لگیں۔

استبداد خواہ سیاست میں پیدا ہو اور خواہ دین میں وہ آزادیٔ فکر کو ختم کر دیتا ہے، اور تاریخ عالم میں جا بجا ایسا ہوا ہے کہ سیاسی استبداد نے دینی استبداد کے ساتھ ایک ابلیسانہ سمجھوتہ کر کے انسانوں کو غلام بنایا ہے جب کسی قوم میں خودداری اور آزادی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے تو اس دوگونہ استبداد کے خلاف جہاد کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

روسی انداز کی اشتراکیت اسی استبداد کے خلاف ظہور میں آئی جس میں عرصۂ دراز سے دین اور سیاست کا گٹھ جوڑ تھا، اور جہاں راسپوٹین جیسے لوگ دین کی آڑ میں مملکت کی مشین پر قابض ہو جاتے تھے۔ اس کے خلاف ایسا زور شور کا ردِ عمل ہوا کہ بھلی معیشت اور سیاست کے ساتھ ساتھ دین بھی سوختنی ہو گیا، اور آزادیٔ فکر کا یہ حال ہوا کہ عبادت کرنے کی تو آزادی ہے لیکن دینی عقائد کی تبلیغ کی اجازت نہیں۔ دین کی مخالفت میں ہر شخص کو کامل آزادی بلکہ حکومت کا عملی تعاون حاصل ہے لیکن دین کی حمایت میں کچھ کہنا یا کرنا ممنوع ہے۔ توحید ممنوع ہے لیکن الحاد آزاد ہے۔

اس انقلاب میں انسانوں کو ایک استبداد سے نجات ملی لیکن ایک دوسرے استبداد میں ان کا فکر و عمل پابزنجیر ہو گیا۔ کوئی حریت پسند انسان ایسی معاشرت میں ایک دن بھی آزادی کا سانس نہیں لے سکتا۔ افسوس ہے کہ ہر قسم کے استبداد

کے مقابلے میں ہم اسلام کو تو پیش کر سکتے ہیں لیکن موجودہ مسلمانوں کو پیش نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود حریتِ فکر و عمل کا سبق فراموش کر چکے ہیں۔ دین کے غلط جوش میں بعضوں کا یہ حال ہے کہ مذہبی تعصب میں اس کو روا رکھتے ہیں کہ مخالف عقیدہ رکھنے والوں کے گھروں اور ان کی عبادت گاہوں کو جلا دیا جائے۔ عارفِ رومی نے کیا خوب کہا ہے کہ ع

"خلق را از انبیا آزادی است"

کہ انبیا دنیا میں اسی لیے مبعوث ہوتے ہیں کہ وہ انسانوں کو تقلید اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرائیں اور سب کو محبت اور رواداری کا سبق پڑھائیں۔ لیکن ہر مذہب اپنے انحطاط کے دور میں متعصب ہو جاتا ہے، اور دین کا اصل منشا سوخت ہو جاتا ہے۔ رواداری اور آزادیٔ فکر تمام اقدارِ حیات کی تولید و ترقی کی ضامن ہیں۔ جہاں یہ آزادی سوخت ہوئی نہ اخلاق باقی رہتے ہیں اور نہ دین میں اصلاح نفوس کی صلاحیت رہتی ہے۔ علوم و فنون کی ترقی رک جاتی ہے۔ تقلید اور جمود زندگی کے تمام شعبوں پر چھا جاتے ہیں۔ تحقیق کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ملتِ اسلامیہ کا احیا تب تک ناممکن ہے جب تک کہ آزادیٔ فکر، رواداری اور تحقیق تمام ملت کا شعار نہ بن جائے۔ حقیقی اسلام یہی تھا اور جس غیر مسلم قوم نے بھی ترقی کی ہے وہ اسی شعار کی بدولت کی ہے۔ بقول اقبال:

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

(ثقافت، ستمبر ۱۹۵۵ء)

اسلام میں مادی ترقی کا مفہوم

اسلام نے کائنات کے ارتقا میں ابتدائی مراحل از روئے قرآن کریم مادی ہی قرار دیے ہیں۔ کہیں افلاک کے متعلق ارشاد ہے کہ ابتدائی حالت میں ھی دخان اور کہیں جدید سائنس کے (Neboler Hypothesis) مفروضۂ دخانی کی طرف صریح اشارہ ہے ان السموٰت والارض کانتا رتقا ففتقنھما کہ ارض سماوات ابتدا میں ایک ملا جلا مخلوط مادہ تھا اور اجرام فلکیہ جن میں از روئے ہیئت ہماری زمین بھی شامل ہے بعد میں ایک دوسرے سے جدا اور منفرد طور پہ متشکل ہوئے ہیں۔ پھر نباتی اور حیوانی زندگی کے متعلق طبیعی سائنس کا ایک نظریہ قرآن کریم میں موجود ہے جس پر ماہرین طبیعیات کو پہنچے ہوئے بہت عرصہ لگا کہ نباتی اور حیوانی زندگی، یعنی کسی قسم کی بائیلوجی کی زندگی، پانی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور پانی ہی اس نباتی اور حیوانی زندگی کی اصل ہے۔ وجعلنا من الماء کل شیء حی

میں نے ایک بڑے ماہر سائنس دان کے سامنے یہ دو آیتیں پڑھیں تو وہ ششدر رہ گیا اور کہنے لگا کہ تکوین عالم طبیعی کا مسلم نظریہ اب تمام سائنس دانوں کے نزدیک یہی ہے۔ خود مادہ میں کسی قسم کی جان ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق قرآنی تعلیم یہ ہے کہ جان اور شعور کے مدارج ہیں اور مادی طبیعی عالم بھی مطلقاً بے جان و بے شعور نہیں اگرچہ اس کی حیات اور اس کے شعور کا انداز انسان پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔

تمام زمین و آسمان، دنیا و مافیہا خدا کی تسبیح میں مشغول ہیں، یعنی مادی عالم کی بھی اپنی صلوٰۃ و تسبیح ہے۔ اسلامی حکماء کا نظریۂ کائنات یونانی فلسفہ کا رہین منت نہیں، مثلاً جلال الدین رومی، ان کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ عالم عناصر طبیعی

بھی روحانی عالم ہے۔ ہم مادے کو مردہ سمجھتے ہیں، خدا کے نزدیک وہ ایک زندہ حقیقت ہے:

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند با من و تو مردہ، با حق زندہ اند

غالب کے ہاں بھی یہ نظریہ ملتا ہے کہ ذرّے سے لے کر آفتاب تک دل ہی دل اور ارواح ہی ارواح ہیں۔ طوطیِ شعور جس طرف بھی رخ کرے اس کے سامنے کوئی آئینۂ دل ہی ہوگا:

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

میر درد جو ایک حکیمانہ مزاج کا صوفی شاعر ہے، کہتا ہے کہ:

آہستہ سے چل میانِ کہسار ہر سنگ دکانِ شیشہ گر ہے

اسلام سے قبل کے نظریاتِ کائنات جو بعض ادیان کا بھی جزو بن گئے تھے، عالمِ مادی کو نظرِ حقارت سے دیکھتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ عالمِ طبیعی محض فریبِ ادراک یا مایا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ وہ عدم ہے، جس میں وجود کو قبول کرنے کی کم و بیش صلاحیت موجود ہے۔ لیکن فی نفسہٖ اس کا کوئی وجود نہیں۔ بعض مادی عالم کو شیطانی عالم کہتے تھے، اور یہ تعلیم دیتے تھے کہ مادہ ظلمتِ محض ہے، اور شیطان اس مملکتِ ظلمت پر حکمران ہے۔ یا یہ کہتے تھے کہ مادی عالم زندانِ ارواح ہے اور زندگی کا نصب العین اس قید خانے سے رہائی پانا ہے۔ طائرانِ لاہوتی قفسِ عنصری میں محبوس ہو گئے ہیں۔ اجرامِ فلکیہ میں تو ان کو نہایت مکمل ریاضیاتی نظم دکھائی دیتا تھا لیکن عالمِ خاک ماتحت افلاک میں زیادہ تر بدنظمی ہی پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے تمام فلسفے اور ادیان انسان کو حیات کش رہبانیت کی طرف لے آئے۔ جسم چونکہ مادی عناصر سے مرکب ہے اس لیے اس کی تخریب کے درپے ہو گئے۔ بیک وقت نفس کشی اور جسم کشی عین روحانی ریاضت اور قربِ الٰہی کا وسیلہ بھی جانے لگی۔ اسلام نے سکھایا کہ اعضائے جسمانی روح کے آلات ہیں جو اس کو اس غرض سے عطا ہوئے ہیں کہ وہ ان کے ذریعے سے حصولِ خیر

کر سکے ۔ ہر عضو کا ایک وظیفہ ہے ، اور اس وظیفہ کا صحیح طور پر ادا کرنا اس کی تسبیح ہے ۔ جسم کو تندرست اور پاک صاف رکھنا جزو دین قرار دیا گیا اور طہارتِ جسمانی عبادتِ ربانی کا جزو لاینفک بن گئی ۔ غیر اسلامی مغرب میں رہبانیت کے دین والوں کا یہ ردِ عمل رہا کہ غسل کرنا ایک قسم کا گناہ ہے ۔ جسم میں جب جوئیں پڑ جاتی تھیں تو جوؤں کو وہ خدا کے روحانی موتی کہتے تھے ، جس سے راہب کا پیراہن مرصع ہو جاتا ہے ۔ ترکِ دنیا اور تخریبِ بدن کے بھیانک نظارے اب بھی بعض قسم کے سادھوؤں میں جا بجا نظر آتے ہیں ۔ زمانۂ قدیم میں ان کی بڑی کثرت اور شدت تھی ۔ مہاتما بدھ کے سوانح میں لکھا ہے کہ وہ بھی ان غلط روایات و شعائر کے زیر اثر کچھ عرصہ تخریبِ جسم اور بدن آزاری میں مصروف ہوئے لیکن حقیقت کے منکشف ہونے پر اس کو گمراہی قرار دیا ۔

قرآن نے مادی عالم اور جسمانی زندگی کو تمام الزامات سے بری کر دیا ، اور یہ تعلیم دی کہ مختلف عالموں میں خاک و افلاک میں ، نبات و جماد و حیوان و انسان میں جو تقسیم ہے وہ قانونِ تدریج کے ماتحت ہے ، فضلنا بعضکم علیٰ بعض لیکن ان کے درمیان کوئی ناقابلِ عبور خلیجیں نہیں ہیں ۔ حیات و کائنات تمام ایک مسلسل وجود ہے جس میں مدارج تو ہیں لیکن کہیں تباعد یا انشگاف نہیں ۔ نیچے سے اوپر تک مسلسل وجود کی کڑیاں ایک لامتناہی سلسلۂ حیات میں منسلک ہیں ۔ جس طرح تمام موجودات کا خالق ایک ہے ، جس کی ذات میں کوئی تضاد نہیں ، اسی طرح موجودات میں بھی تعاون اور ہم آہنگی ہے ، تخالف نہیں ۔ اسلام صرف خدا ہی کی وحدت کا قائل نہیں بلکہ اس سے مشتق موجودات کی وحدت کی بھی تعلیم دیتا ہے ۔ عالم کے کسی پہلو کو نظرِ حقارت سے نہ دیکھا جائے ، کیونکہ ربّ فقط کسی ایک کا ربّ نہیں ہے بلکہ رب العالمین ہے ۔ اسلام نے رہبانیت کو مذہب سے اور انسانی زندگی سے خارج کر دیا ۔ اگرچہ غیر اسلامی اثرات سے بعض صوفیوں نے اس کو اختیار کیا ۔ اسلام بار بار کہتا ہے کہ

فلاحِ عامہ کے لیے بے دریغ خرچ کرو، تو اس سے لازم آتا ہے کہ پہلے جدوجہد سے اسبابِ حیات حاصل کرو اور اس فراوانی سے حاصل کرو کہ دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اس لیے اگر فقر کے یہ معنی ہوں کہ انسان کے پاس اپنے لیے ہی سامانِ حیات نہ ہو، تو ایسا فقر خیرات کیا کرے گا وہ تو خود محتاج اور مسکین ہو گا۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ "مفلسی سے دونوں جہانوں میں منہ کالا ہوتا ہے۔" (الفقر سوادُ الوجہ فی الدارین)۔ اور پھر اس کی یوں تشریح فرمائی کہ مفلسی انسان کو کفر کے بہت قریب لے آتی ہے۔ مفلس کے لیے ایمان کی سلامتی دشوار ہو جاتی ہے۔ جو شخص ہمت کر کے کمائے گا نہیں وہ لازماً اپنی خودداری کھو کر گداگر ہو جائے گا اور لجا لجا کر اور منہ سکیڑ سکیڑ کر دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا رہے گا۔

رسول کریمؐ نے فرمایا کہ یوم الحساب میں سائلوں کے منہ پر گوشت نہیں ہو گا۔ عالمِ مثال میں گداگر کی یہی صورت ہوتی ہے۔ جس فقر کی رسول کریمؐ نے تعریف کی ہے وہ ایک بہت بلند اندازِ حیات ہے۔ وہ زندگی کی خود اختیار کی ہوئی سادگی ہے، وہ فرائضِ حیات کو پورا کرتے ہوئے مادی نفع و ضرر سے بے نیازی ہے، وہ اس اخلاق کا نام ہے کہ جب دوسروں کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہ ہو رہی ہوں تو کوئی صاحبِ دل آدمی اپنے پاس اسبابِ تعیش کا ڈھیر نہ لگاتا جائے۔

جس شخص کے پاس جائز طور پر مادی اسباب فراہم ہوں وہ دین اور اخلاق کے معاملے میں مقابلتاً آسانی سے فرائض کو انجام دے سکتا اور انسانی ہمدردی کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ ایک مفلس مومن نے رسول کریمؐ سے شکایتاً یا کسی قدر تاسف سے کہا کہ غنی لوگ خیرات کرتے اور ثواب کماتے ہیں۔ ہم مفلس ایسا نہیں کر سکتے اس لیے گھاٹے میں رہتے ہیں۔

نبی رحیم و حکیم ؐ نے اس کی تسلّی کے لیے فرمایا کہ تم اس صدقہ کی بجائے عبادت زیادہ کر لیا کرو۔ پھر سائل نے کہا کہ بعض امیر ایسے ہیں کہ خیرات بھی کرتے ہیں اور عبادت بھی کرتے ہیں۔ وہ پھر بھی ہم سے آگے آگے ہی رہیں گے۔ رسول کریم ؐ نے فرمایا کہ پھر یہ فضل الٰہی ہے، یعنی ایسی صورت میں مساوات کی اور کیا تجویز کر سکتے ہو۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ رزق کو اپنی کوشش سے زمین کے اوپر بھی ڈھونڈو، اور پیدا کرو، اور جنایائے ارض یعنی زمین کے چھپے ہوئے خزانوں میں سے بھی نکالو۔ خوب کماؤ اور دولت پیدا کرو۔ لیکن ظلم کے ساتھ نہیں، حدود الٰہی کو نظر انداز کر کے نہیں، بلکہ رحم اور عدل کے ساتھ اور اس کے بعد اس فراوانی کو نوع انسان کی فلاح کے لیے پھیلاؤ۔ خزانے کے سانپ بن کر نہ بیٹھ جاؤ۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان صدیوں تک دوسری معاصر قوموں کے مقابلے میں زیادہ خوش پوش تھے۔ زیادہ اچھے مکانوں میں رہتے تھے۔ اچھی سواریاں رکھتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ فراخ مکان اور تیز سواری خدائے کریم کی خاص نعمتوں میں سے ہے جس کو حاصل ہو وہ بڑا خوش نصیب ہے۔

ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ بارھویں، تیرھویں صدی تک یہ حال تھا کہ اسلامی ممالک میں متوسط درجے کا مسلمان رہائش اور پوشش میں یورپ کے شہزادوں سے بھی بہتر رہتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جلد جلد کپڑے بدلنے کا رواج یورپ کے اعلیٰ طبقوں میں بھی نہ تھا، اور نہانا تو کبھی شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ باغبانی کا فن مسلمان مغرب میں لے گئے اور یورپ میں بہت سے اعلیٰ درجے کے میوے مسلمانوں کے ذریعے سے وہاں پہنچے۔ ہر دولت مند ایک اچھا باغ بنانا جزو تہذیب و تمدن سمجھتا تھا۔ مسلمانوں نے فن تعمیر میں جو کارہائے نمایاں کیے، ان میں سے بعض اب بھی صفحۂ روزگار پر موجود ہیں۔ جو فن کاروں سے خراج تحسین حاصل کرتے اور ناظرین کے لیے فردوس نظر ہیں۔ مسلمانوں کی ترقی محض اخلاقی اور علمی ترقی نہ تھی۔ بہتر اخلاق اور بہتر عمل سے مادی

زندگی کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ایمانداری سے صنعت اور تجارت میں ترقی ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے پہلی قوموں کی صنعتوں کو حاصل کیا اور پھر اپنی جدتوں سے ان کو چار چاند لگائے۔ چمڑے کی اعلیٰ قسم کی دباغی مسلمانوں نے اہلِ مغرب کو سکھائی۔ چنانچہ اب تک چمڑے کی ایک اعلیٰ اور ملائم قسم (Morroco Leather) یعنی مراکشی چمڑا کہلاتی ہے۔

کاغذ مسلمانوں کے ذریعے سے یورپ میں پہنچا۔ اب مغرب کے مؤرخین اس کا اقرار کرتے ہیں کہ تجربی سائنس کی ابتدا مسلمانوں نے کی جس کی طرف سے یونانی حکمت بالکل غافل رہی تھی۔ یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) بہت کچھ مسلمانوں کی رہینِ منت تھی۔ اس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ:

بجھ کے شمعِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی　　اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
دورِ گردوں میں نمو نے سینکڑوں تہذیب کے　　پل کے نکلے مادرِ ایام کی آغوش سے

اب کوئی پوچھے گا کہ عالمِ مادّی کے متعلق اسلام کا نظریہ بالکل صحیح، اور حیات پرور اور مسلمانوں کی ابتدائی شش صد سالہ ترقی کی داستان بھی درست۔ لیکن اب ان کو کیا ہوا ہے، جہاں تک مادّی ترقی کا تعلق ہے سب طرف پستی ہی پستی ہے۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمان اقوام پس ماندہ اقوام کے زمرے میں داخل ہیں۔ گذشتہ تین سو سالوں میں یورپ علوم و فنون اور مادّی ترقی میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتا ہوا کہاں سے کہاں نکل گیا۔ مسلمان اقوام کو کیا سانپ سونگھ گیا کہ یہ سوتے ہی رہے۔ مغربی قوموں میں صدیوں کے جمود کے بعد مسلسل حرکت پیدا ہوتی رہی اور یہاں تمام حرکت جمود میں تبدیل ہو گئی۔ ہمارا دریائے حیات ساحل کی طرح آسودہ ہو گیا اور وہاں ساحل بڑھتی ہوئی طغیانی کی زد میں آتے گئے۔ ملتِ اسلامیہ کو متحرک کرنے والا اور جمود کا دشمن اقبال کہتا ہے:

ساحل آسودہ گفت گرچہ بسے زیستم ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتہ تیز خرامید و گفت ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

مغرب کیسے آگے بڑھتا گیا؟ اور مسلمان کیسے پیچھے رہتے گئے اس کے اسباب کا تجزیہ بڑی وسیع تحقیق چاہتا ہے۔ فلسفۂ تاریخ کا ایک محقق لکھتا ہے کہ قومیں ایک اندازِ حیات پر زندگی بسر کرتے ہوئے اور اپنے خاص افکار و جذبات سے تہذیب و تمدن کا ایک ڈھانچہ بناتے ہوئے کوئی چھ سو برس کے عرصے میں تھک جاتی ہیں۔ اندازِ حیات کی کچھ لکیریں پڑ جاتی ہیں اور زندگی ان لکیروں سے اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے، جو پہلے تمام ڈھانچے کو گرا کر نئی تعمیریں بنائے۔ مولانا روم کا مشہور شعر ہے کہ:

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اول آں تعمیر را ویراں کنند

ایک دوسرا شعر اس مضمون سے ملتا ہوا کسی اور استاد کا ہے جس پر اقبال نے ایک تضمینی نظم بھی لکھی ہے:

مغاں کہ دانۂ انگور آب مے سازند
ستارہ مے شکنند آفتاب مے سازند

بعض مؤرخوں کا خیال ہے کہ یورشِ تاتار کے بعد مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی اور علمی و فنّی ترقی رک گئی، ان کے کتب خانے اور رصد گاہیں سپردِ آتش ہو گئیں علوم و فنون کے حاصل، امصار و دیار تباہ ہو گئے اور اہلِ علم نابود ہو گئے۔ اس کے بعد ترکوں نے مسلمان ہو کر سیاسی طاقت تو حاصل کر لی لیکن علوم میں اضافہ نہ کر سکے۔ دوسری قومیں مسلمانوں سے زیادہ اسلامی زاویۂ نگاہ پیدا کرتی گئیں، اور قرآنی پیش گوئی کے مطابق وارثِ ارض ہو گئیں۔ بقولِ اقبال:

مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

اب یہ حال ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کی عملی صورت بھی دوسروں سے سیکھنی پڑتی

ہے۔ قرآن نے تو کہہ دیا تھا کہ:

تلک الایام ندا ولھا بین الناس

خدا کے نزدیک کوئی قوم ازلی اور ابدی طور پر محض الفاظ اور عقائد کو دہرانے سے چہیتی قوم اور نجات یافتہ قوم نہیں ہو سکتی۔ اسلام کو قائم کرنے والے وہ تھے جن کے متعلق فرمایا: کنتم خیر امۃ اخرجت للناس۔ اب مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ خیر امۃ ہیں وہ خود بھی شامل ہیں، خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں۔ یہ خود فریبی ہے جس میں اہل کتاب اور دیگر ملتیں اسلام سے قبل مبتلا تھیں۔ اسلام ہمہ گیر ارتقائے انسانی چاہتا ہے، اور مادی ترقی بھی اس ہمہ گیر ترقی کا ایک لازمی پہلو ہے۔

(ثقافت، اکتوبر ۱۹۵۵ء)

اسلام کا سیاسی و معاشی تصوّر

یہ بات بخوبی معلوم و مشہور ہے کہ اسلام محض کوئی مابعد الطبیعی عقیدہ نہیں۔ بلکہ وہ زندگی کا ایسا مکمل نظام اور جامع تصوّر ہے جو ایک منطقی ربط کا حامل ہے۔ ہم اس کے نظریات کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے ہم دیکھیں گے کہ وہ ہر بڑے منصوبہ کے بعض اجزا سے اتفاق کرتا ہے اور بعض دیگر حصول کو رد کر دیتا ہے۔ ہر منصوبہ کا اس طرح مختصر بیان یہ ظاہر کر دے گا کہ کوئی ایسی اہم خرابی یا تو اس کی بنیاد ہی میں موجود ہے، یا وہ عواقب جو ناگزیر طور پر اس سے رونما ہوتے ہیں اسے فاسد کر رہے ہیں۔

اصولِ عدم مداخلت پر مبنی سرمایہ داروں نے مجرد حریّت اور مساوات کی تبلیغ کی۔ مگر مملکت تنازع للبقا میں غیر جانبدار رہ کر اس کا تدارک نہ کر سکی کہ ظالمانہ عدم مساوات سر نہ اٹھانے پائے۔ معاشرہ کو جاگیری اور شخصی حکومتوں کی ظلم و زیادتی سے آزادی دلا کر اس نے ایک قسم کی زرخرید غلامی کی ترویج کی۔ آزادانہ معاہدہ اور آزاد رائے کا حق بے سود ثابت ہوا۔ سیاسی عمومیت معاشی غلامی کے ساتھ متحد ہو گئی۔ انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں سرمایہ دارانہ جماعت نے ان خرابیوں کو رفتہ رفتہ دور کرنے کی ایسی کوششیں کیں جو بے قید سرمایہ داری سے صورت پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن جو مشکلات اور دشواریاں اس نظام کے مزاج سے رونما ہوتی ہیں وہ معاشری انتشار و تشتت پیدا کرتی ہیں۔

اسلام حریت، اخوّت اور مساوات پر مبنی ہے، اور اس کا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ خدا پرستانہ ہے۔ زندگی کے تمام فلسفے اور وجود سے متعلق اساسی اندازے زبردست عملی نتائج رکھتے ہیں۔ راسخ الاعتقاد اشتمالیت کا فلسفہ مادہ پرستانہ اور ملحدانہ

ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی ایک روحانی ماخذ، ایک روحانی پس منظر، ایک روحانی مطمح نظر اور مقصد رکھتی ہے۔ کائنات پر بے بصر میکانی قوتوں کی کارفرمائی نہیں ہے، اور نہ وہ محض مادہ پرستانہ جدلیات کی تابع ہے۔ زندگی ایک مادی اساس بھی رکھتی ہے، اور اس کی اس حیثیت کو اسلام نظرانداز نہیں کرتا۔ یہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ انسان کو روحانی طور پر آزاد رکھنے کی خاطر اسے مادی خوش حالی کا یقین دلایا جائے۔

ایک مہربان، ہمہ دان، اور ہمہ تواں ہستی کی تخلیق کردہ کائنات اخلاق سے بے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ وہ قطعاً خیر و خوبی ہے۔ جس کے طریقہ ہائے عمل چند دائمی اقدار کو وجود بخشتے ہیں۔

روح اور جسم کے درمیان، یا دنیا اور آخرت میں کوئی تناقض نہیں۔ چونکہ خدا ایک ہے اس لیے جملہ موجودات باہم مربوط ہیں۔ مسلمانوں کو دوسری دنیا کی خوش حالی سے قبل اس دنیا کی خوش حالی کے لیے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اخلاقی علت و معلول یہاں اس دنیا میں جس طرح اپنے اثرات مترتب کرتے ہیں ایسے ہی وہ اپنے اس عمل کو آخرت میں جاری رکھیں گے۔ اشتمالیت تخلیق کے من جانب اللہ ہونے کی تردید کرتی ہے، اور اس کی تمام تاریخ انسانیت کی تشریح تمام مادی مظاہر کی طرح سراسر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ صرف پیدائش دولت کے طریقے اخلاقی، مذہبی اور تہذیبی اقدار پیدا کرتے ہیں۔ تاریخ کی قرآنی تشریح بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہ دعویٰ کے ساتھ کہتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال قوم کے اعتقادات اور سیرتوں میں تبدیلیوں کے سبب سے ہوتا ہے اور اسلام یہ یقین رکھتا ہے کہ بصیرت سے محرومی کے باعث قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی رو سے حقیقی انقلاب کسی قوم کی زندگی میں واقع نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے اخلاقی اور ذہنی نقطہ نگاہ میں بھی تبدیلی نہیں ہوتی

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا خدا کسی قوم کی زندگی میں اس وقت تک

بانفسھم۔ تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک کہ ان کے
نفوس کے اندا تبدیل نہیں جاتے۔ (انفال۔ ۵۳)

قرآن مادی طور پر خوش حال قوموں کی مثالیں پیش کرتا ہے جو مادہ پرستانہ تنگ نظری کے سبب تباہ ہوگئیں۔ قانونِ اخلاق کے ابدی حقائق پر ایمان نہ لانے سے وہ خود غرض اور ظالم بن گئیں۔ انھیں اصلاح کے لیے بڑی بڑی مہلتیں دی گئیں لیکن جب انھوں نے خدا کی نشانیوں کی پرواہ نہ کی تو سزا کا دن ان پر آپہنچا اور وہ تباہ ہوگئیں۔ "خدا نے خیر وشر کی میزان قائم کی ہے۔ یہ میزان ایسی حساس ہے کہ ہر ذرہ اس میں وزن کیا جاتا ہے۔ اور جس کا نتیجہ اپنے وقت پر ظاہر ہوتا ہے۔" تاریخ کا اسلامی نظریہ اس کے خدا پرستانہ نقطۂ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور تاریخ کا اشتمالی نظریہ اس کی مادّیت سے رونما ہوتا ہے۔ یہ دو نظریات کلی طور پر باہم ایسے متخالف ہیں کہ ایک خدا پرست مسلمان کے لیے مارکسی، اشتمالی بننا ناممکن ہو گیا ہے۔

فاشستوں نے محض پیدائش دولت اور مساویانہ تقسیم کی پرستش کو مملکت کی پرستش سے مبدّل کر دیا۔ مملکت کی پرستش بجز بڑے پیمانہ پر قبائلیت کے، جو دورِ وحشت کی تہذیب کی یادگار ہے، اور کچھ نہیں۔ "غلط یا صحیح جو کچھ بھی ہو میرا وطن ہے۔" فاشیت ایک طاقتور مملکت کی تعمیر چاہتی ہے۔ اور بطور فوق الفرد ہستی کے مملکت کی پرستش کی تلقین کرتی ہے۔ اسلام بھی ایک طاقتور مملکت کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو قوم کے اساسی حقوق کا تحفظ کرے، باہر کے حملہ آوروں سے اپنا بچاؤ کرے۔ اور طاقت ور کی ظلم و زیادتی سے کمزور کی حفاظت کرے۔ اسلام ایک اجتماعی اور سیاسی مذہب ہے، اور اس کے تمام آئین و دستور کا تعلق معاشری عدل اور معاشری اتحاد سے ہے۔ تاہم مملکت یا اس کے قائدین اور حکمرانوں کی غیر مشروط اطاعت واجب نہیں ہے۔ قانون اور نظم و ضبط کی خاطر بالادستوں کی اطاعت کی تعلیم دی گئی ہے۔

لیکن یہ اطاعت ہمیشہ احکام کے اخلاقی ہونے پر مشروط ہے:
لا طاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق   خالق کی نافرمانی کرکے مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔
اسلام کا اساسی اصول ہے۔ صدر حکومت تک کے اعمال و احکام پر ایک ادنیٰ ترین باشندۂ ملک برسرِ عام نکتہ چینی کر سکتا ہے۔

اسلام کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ خود آں حضرتؐ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ نے نادانستہ کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو وہ اپنے انتقام کا حق خود آپ کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ فاروق اعظمؓ اور حضرت علیؓ بارہا بلا رعایت دادخواہی کے لیے عدالت میں بحیثیت مدعی اور مدعا علیہ کے حاضر ہو چکے ہیں۔

اسلام شوریٰ کے ذریعہ حکومت کی تعلیم دیتا ہے۔ آنحضرتؐ تقریباً ہر روز معاملاتِ حکومت میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن اوصافِ حسنہ ہی سے بطور خوبی کے اس وصف کا اظہار کرتا ہے کہ وہ مستبد اور آمر نہیں ہوتے بلکہ اجتماعی اہمیت کے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔

قرآن میں مسلمانوں کو امتِ وسطیٰ کا خطاب دیا گیا ہے۔ جو انتہاؤں میں ہمیشہ خیر الامور اوسطہا پر عمل کرتے ہیں۔ یہ یونانیوں کے نظریۂ حیات کے مشابہ ہے۔ جن کا قول تھا کہ زیادتی میں کچھ بھی نہیں۔ خیر الامور اوسطہا کا اصول ارسطاطالیسی اخلاقیات میں محوری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت اس کی تمام تعلیمات اور عمل میں جاری ہے۔ اسلام کی جگہ اخلاقیات عملی اخلاقیات ہے۔ جس نے رینان کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اسلام بنی نوع انسان کا مذہب ہے یہ فرشتوں کے لیے نہیں ہے۔ ہر حکم میں انسان کی اصلی فطرت کو معہ اس کی تمام جبلتوں اور خواہشات کے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وجدانات اور جذبات زندگی کے لیے بطور آلات کے ہیں۔ یہ نظم و ضبط میں لانے کے لیے ہیں، فنا کرنے کے لیے نہیں۔ آنحضرتؐ کے ایک صحابی نے اپنے رنج و افسوس کا

اظہار ان الفاظ میں کیا تھا: "جب میں آپؐ کی صحبت میں رہتا ہوں تو میرا اخلاقی رنگ نہایت بلند و برتر رہتا ہے۔ بلند خیالات اور معیارات میری شعوریت میں جاری و ساری رہتے ہیں۔ لیکن جب میں آپؐ سے دور رہتا ہوں تو میری اخلاقی سطح یکایک پست ہو جاتی ہے۔ میں اپنی حالت پر کس قدر افسوس کرتا ہوں۔" اس کو سن کر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: "تم کو مایوس اور پست ہمت نہ ہونا چاہیے۔ تم انسان ہو فرشتہ نہیں ہو۔ اگر خدا یہ چاہتا کہ دنیا کو ایسی ہستیوں سے آباد کرے جو اخلاقی کش مکش سے آزاد ہوں، تو وہ ملائکہ کو یہاں بساتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔ تمھاری اخلاقی پشیمانی اور یہ بلندی اور پستی کا احساس ایمان کی علامت ہے۔" یہ سن کر آپؐ کے صحابی کو اطمینان حاصل ہوا۔

انسانی اصلاح و ترقی کے بعض عظیم پروگراموں کا خاکہ مختلف اقوام کے حالیہ مفکرین، قائدین اور مصلحین نے کھینچا ہے۔ ان اصلاحی تجاویز میں سے ہر ایک میں چند ایسے اصول ہیں جو اسلامی غیبیات کے اجزا ہیں۔ لیکن ان سب میں جزوی صداقتوں پر دروغ بیانی کی حد تک مبالغہ آمیزی کی گئی ہے۔ دیگر اجزا کے اخفا کے ساتھ چند اجزا پر متشددانہ تاکید نے انھیں بحیثیت مجموعی زندگی کے ساتھ سلوک میں ناکام و نامراد رکھا ہے۔ حریت پسند عمومیت میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کی جزو لاینفک ہیں۔ ہر ایک کو مساوی مواقع ملنے، اور قانون کی نظر میں سب کے برابر ہونے کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ لیکن نسلی اور قومی تعصبات حریت پسند عمومیت کے عقائد و اعمال کو اب تک فاسد کر رہے ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ کافی حریت پسندانہ نہیں ہے۔ نہ اسلام اس کے سرمایہ دارانہ نظام کی تائید کر سکتا ہے، جس میں سود کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے حاشیہ خیال میں آنے سے قبل اسلام نے تمام علوم کی آزادی کے ساتھ آزادئ تقریر اور آزادئ ضمیر کی تعلیم دی تھی۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ یہ قرآن کے اساسی اصولوں میں سے

ایک ہے، مغربی عمومیت شہری حقوق میں باشندوں کی مساوات کے اسلامی حکم کو تسلیم کرتی ہے لیکن وہ باشندوں کی اکثریتوں اور اقلیتوں میں تقسیم کو ضروری اور مخالف جماعتوں کے وجود کو لازمی سمجھتی ہے جن کا مقصد حکومت کے معاملات میں تقریباً ہر چیز کی مخالفت کرنا ہوتا ہے۔ یہ مخالفت صرف مخالفت کی خاطر کی جاتی ہے جس کا متعین مقصد بے اختیار کرنا اور برسر اقتدار جماعت کو بالآخر بے دخل کرنا ہے۔ اشتمالیوں اور فاشستوں دونوں نے انتخابی جماعتوں کی سر پھٹول کو ترک کر دیا، اور صرف ایک کارفرما جماعت قائم کی جو افراد یا جماعتوں کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت برداشت نہ کیا کرے۔ اسلام کا سارا رجحان ان دونوں متبادل صورتوں کے خلاف ہے۔ ایک جماعت کی حکومت باشندوں کے آزادانہ احساسات کے اظہار کو سلب کر لیتی ہے۔ ایسی یک جماعتی حکومتوں میں فرد کے لیے کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کو یا تو جماعت کے احکام کی موافقت کرنی پڑتی ہے یا اپنے ضروری حقوق سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح حریت پسند عمومیتوں کی جماعتی سیاسیات کے اقتدار کی جدوجہد میں صداقت اور عام خوش حالی برطرف ہو جاتی یا نہایت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر پارلیمان میں قوم کے نمائندوں کی گروہ بندی ہوتی ہے۔ ایک آزاد انسان پابند بن جاتا ہے اس طریقہ میں ایک آزاد خیال انسان اگر کبھی وہ منتخب بھی ہو جائے تو نکما سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی جماعت اس پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ یہی اسلامی مجلس شوریٰ میں جیسا کہ حضرت عمرؓ اکثر طلب فرمایا کرتے تھے، اصحاب فہم و کردار بغیر کسی آمرانہ جماعت کو ترتیب دیئے یا اکثریت اور اقلیت میں منقسم ہوئے، باہم مجتمع ہوا کرتے تھے۔ اگر کوئی اسلامی مملکت مجالس یا مشاورتی جماعتوں کو مخصوص یا عام مسائل کے حل کرنے کے لیے طلب کرے تو ہر رکن ایک آزاد رکن ہونا چاہیے۔ جو خاص علاقوں یا خاص مفادات کی نمایندگی کرے، جو کسی پارٹی کے طریقہ پر منتخب نہ ہوا ہو۔ اس کا انتخاب صرف اس کے علم اور قابلیت کی بنا پر ہوا ہو۔

اسلامی مملکت، فاشستی مملکت کے پیش نامہ کے بعض اجزا کی، اس کے جملہ تصورات کی تائید کیے بغیر توثیق کرتی ہے۔ فاشیت قوم کو ایک عضوی کل میں ڈھالنا چاہتی ہے۔ جس میں مفاد کی خاطر لڑائیوں کو اتنا کھل کھیلنے کا موقع نہ دیا جائے جس سے قومی یگانگت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس میں ذاتی ملکیت کے حق کو اسلام کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن آجر و اجیر کے تمام حقوق مملکت کی پوری نگرانی اور اختیار میں ہوتے ہیں۔ فاشستی پیش نامہ میں بہت کچھ ایسی چیزیں ہیں جو قابل تعریف ہیں۔ لیکن فاشستی مملکت کا اصلی محرک فاسد ہے۔ اس مملکت کا قیام نسلی یا قومی اساس پر ہوا ہے۔ مملکت ایک موضوعِ پرستش بن گئی ہے جو خود اپنی ایک زندگی افراد کی زندگیوں کے علاوہ رکھتی ہے۔ یہ مابعد الطبیعی اور افسانوی وجود کسی قسم کے اخلاقی مقاصد نہیں رکھتا۔ فرد کی اخلاقیت کا اس پر انطباق نہیں ہوتا۔ مملکت کا مقصد طاقت اور عظمت کو برقرار رکھنا اور باشندوں کو بے چون و چرا اور بر اسرار اطاعت کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ بین الاقوامیت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ عالم انسانیت ایک بے حقیقت چیز سمجھی جاتی ہے اور اس کے لیے کوششیں منافقت سے موسوم کی جاتی ہیں۔ فاشستیت کی رو سے قومی جماعتوں میں حیاتی تنازع للبقا ہوتی ہے جو برتر قوت کے ذریعہ بقا کے سوا اور کوئی قانون تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے لیے جنگ کے لیے تیار رہنا ہر مملکت کا اولین فرض ہے۔ اور امن پسندی ذلیل و خوار لوگوں کا مذہب و ایمان ہے۔ جبری ہم آہنگی کے طریقوں کو جاری کر کے قوم کے اندرونی تضادات کو رفع کرنے کے بعد یہ مختلف مملکتوں کے درمیان آویزشوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ جیسے یک جماعتی آمریت کی بنا قوت ہے ایسے ہی فاشستی مملکت کا اساسی تصور تصادم ہے۔ اسلام نسلی یا قومی حد بندیوں کو اہم اور قطعی تسلیم نہیں کرتا اور جملہ بین الاقوامی مساعی امن کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ان تمام مبادیات و اصول کی اساس پر جو مختلف

مذاہب یا قوموں اور جماعتوں میں باہم مشترک ہیں، ان کے ذریعہ پُرامن تعاون عمل پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ان چیزوں کی طرف جو ان میں باہم مشترک ہیں، مسلمانوں کے ساتھ تعاونِ عمل کی دعوت دی گئی ہے۔

فاشستیت نے مجلسِ اقوام کی اساس کا مضحکہ اڑایا۔ مجلسِ اقوام اور اس کی جانشین اقوامِ متحدہ نے نہایت اعلیٰ نصب العین کا اعلان کیا۔ لیکن ان کو روبہ عمل لانے میں بُری طرح ناکام رہیں۔ بجائے امن کے قوت ان کے قلوب پر حکمران تھی۔ اور اس ذہنی ساخت کے ساتھ بین الاقوامی انصاف کے دائرہ میں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنے کی بہت کم امید ہو سکتی تھی۔ اولاً یہ کہ ان کے لیے انصاف کے ایک کھلے طریقے پر متفق ہونا ہی دشوار تھا۔ پھر اگر اتفاق سے وہ راضی بھی ہو جائیں، اور انھیں کوئی ایثار و قربانی کرنی پڑے تو نہ وہ اس کا عزم رکھتی ہیں اور نہ ان کے پاس اپنے فیصلہ کو روبہ عمل لانے کی کوئی قوت ہے۔ مجلسِ اقوام پر فاشستی اعتراض اگرچہ اس کی عدمِ صلاحیت پر مبنی تھا لیکن اس میں سرے سے بین الاقوامی انصاف کے تصور ہی کو رد کر دیا گیا تھا۔ فاشستی تصور یہ ہے کہ طاقت ور کا یہ حق ہے کہ قبضہ کرے اور تصرف میں رکھے جہاں تک ممکن ہو سکے۔ اور یہ کمزور کی قسمت ہے کہ وہ مغلوب، محکوم، اور مطیع بنا رہے۔ اگرچہ اندرونِ مملکت آویزشوں کو ختم کر دینے اور قومی یگانگت کو حاصل کرنے کے فاشستی طریقوں کی ستائش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک حقیقی اسلامی مملکت کے لیے اس کا اتباع ایک زبردست اخلاقی زیاں ہے جس کا مقصد تمام نسلی اور قومی حدبندیوں سے ماوراء ہو کر عالمگیر امن جہاں کا قیام ہے۔

قرآن نے اپنی اس تعلیم سے ایک حقیقی اور مؤثر انجمنِ اقوام کی اساس کا اعلان کیا ہے کہ اگر دو جماعتیں اپنے کسی اہم حق کے لیے آپس میں لڑ پڑیں تو غیر جانب دار جماعتوں کی طرف سے منصفانہ طریقہ پر اس قضیہ کے تصفیہ کی کوشش کی جانی چاہیے۔ فیصلہ صادر ہونے پر متخاصم جماعتوں پر اس کی پابندی

لازمی ہوگی۔ اگر کوئی جماعت سرتابی کرے، اور فیصلہ کے مطابق عمل کرنے سے انکار کرے تو تمام جماعتوں کو باہم مل کر قوت کے ذریعہ اس کو منوانا چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی مجلسِ اقوام کبھی باثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس قرآنی حکم پر عمل پیرا نہ ہو۔

مملکتِ فلاح و خیر

جدید مملکتوں نے تدریجاً ایک مملکتِ فلاح و خیر کا تصور پیدا کیا ہے۔ مگر ایک تاریخ دان کے لیے اس حقیقت سے انکار دشوار ہوگا کہ مملکتِ فلاح و خیر کو تشکیل دینے والے اور اس کو روبہ عمل لانے والے پہلے مدبّر آنحضرتؐ تھے۔ اس وقت بھی جب کہ انگلستان نے اپنے سیاسی اداروں کو ترقی دی تھی، اور پارلیمانی حکومت ایک قابلِ عمل اساس پر استوار کی تھی تو اس کا زبردست فلسفی ہربرٹ اسپنسر اصولِ عدمِ مداخلت کی حامی مملکت کے تصور کی تائید کر رہا تھا۔ جو محض ایک پولیس مین کی طرح کارگذار ہو۔ ایسی انتظامی مملکت اپنے باشندوں سے محصول جمع کرتی ہے تاکہ محصول ادا کنندوں کی طرف سے فوج اور پولیس کو رکھے اور حملہ آوروں اور قانون شکنوں کے خلاف باشندوں کی محافظت کرے۔ مملکت کو باشندوں کے قتل، ذاتی نقصان اور چوری و فریب دہی کا بھی انسداد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ مملکت زیادہ سے زیادہ تعلیم اور صحتِ عامہ پر خرچ کر سکتی ہے۔ قوم کی معاشی زندگی میں اسپنسر مملکت کی مداخلت کا خواہاں نہ تھا جو صرف آزادانہ معاہدہ پر مبنی ہونی چاہیے۔ قانونِ طلب و رسد بطورِ خود توازن پیدا کرے گا۔ آدم اسمتھ نے جو معاشیات میں اصولِ عدمِ مداخلت کا باوا آدم ہے حکومت کے اعمال کو صرف تین چیزوں پر محدود کیا ہے۔ اس کا قول ہے "فطری آزادی کے اصول کے بموجب بادشاہ کو صرف تین فرائض انجام دینے پڑتے ہیں، اور یہ ہیں حقیقی اہمیت رکھنے والے تین فرائض جو فہمِ عامہ کے لیے سادہ اور آسان ہیں۔

اوّلاً، معاشرہ کو دیگر آزاد معاشروں کے تشدد اور حملہ سے محفوظ رکھنا۔ ثانیاً، سوسائٹی کے ہر رکن کی اس کے دیگر ارکان کے ظلم و زیادتی سے تاحدِ امکان حفاظت کرنا یعنی صحیح عدل و انصاف قائم کرنا۔ ثالثاً، چند تعمیرات اور چند ادارہ جات قائم کرنا جن کا قیام و برقراری کسی فرد یا افراد کی قلیل تعداد کے مفاد کے لیے نہ ہو۔

مملکت کے یہ محدود فرائض آجروں اور سرمایہ داروں کو نفع اٹھانے کی بے روک آزادی عطا کرتے ہیں، اور دولت کی غلط تقسیم معاشرہ کو دو متحارب گروہوں میں بانٹ دیتی ہے۔ مملکت کی طرف سے کوئی علاج تجویز ہونے سے قبل مالداروں اور ناداروں کے درمیان خلیج وسیع ہو جاتی ہے۔ مزدوروں کی ہڑتال کے خلاف حکومت پولیس کے فرائض انجام دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ سیاست دان اور انسانیت دوست مفکرین مملکت کے فرائض میں وسعت دینے کی تحریک شروع کرتے ہیں۔ پہلا علاج معاشری عدم مساوات کو جزوی طور پر ہموار کرنے کے لیے محصول کا ایک اصلاح شدہ نظام تھا۔ سرمایہ دارانہ مملکتوں نے اپنے دائرۂ عمل کو وسیع کرنا شروع کیا۔ رہائش، بے روزگاری کا بیمہ، تندرستی کا بیمہ، وظیفۂ پیرانہ سالی، اور دیگر متعدد ہمدردانہ تدابیر رفتہ رفتہ تجویز کی گئیں اور بعض ممالک نے انھیں ایک حد تک اختیار بھی کیا۔ یہاں تک کہ ہم بیورج کے منصوبہ (Beveridge Scheme) پر پہنچتے ہیں جس نے ایک مکمل لائحۂ عمل، ایک مملکتِ خیر کے لیے ترتیب دیا ہے۔ یہ رجحانات اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ دنیا کس طرح آزمائش و فروگذاشت کے طولانی عمل سے گذر کر درجہ بدرجہ آنحضرتؐ کے تصورِ مملکت کی معقولیت اور صداقت کو دیکھنے کے لیے قریب آرہی ہے۔

سود کی بابت اسلام کا نقطۂ نگاہ بہت واضح ہے۔ آنحضرتؐ اس پر مصر تھے کہ تمام معاشی معاملات میں سود کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ اس وقت مغرب کے

تمام بڑے معاشیین کسی قدر جھجکتے ہوئے اسی نظریہ کے قریب آرہے ہیں کہ بنک کاری کو قومی بنایا جائے اور سود پر قابو حاصل کیا جائے۔ کینس نے مملکتوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ اس خصوص میں اخلاقی اور مذہبی تحدیدات عاید کریں۔ لیکن اب بھی معاشیین یہ خیال کرتے ہیں کہ سود کو مطلقاً موقوف کر دینا کوئی قابلِ عمل تجویز نہیں ہے۔ اس پر صرف قابو پانا اور پیدائشِ دولت کے لیے اس کو انتہائی ادنیٰ سطح پر لے آنا چاہیے۔ اسلام سرمایہ کے مالک کو پیدآور مزدور کے ساتھ حصہ دار بننے کی اجازت دیتا ہے، تاکہ سرمایہ پیدائشِ دولت کے ساتھ ناقابلِ شکست طور پر مربوط رہے اور تجارت کے نشیب و فراز میں دونوں شریک رہیں۔ جب سود پیدآوری سے محروم ہو جاتا ہے تو مدیون عام خطرات برداشت کرتا ہے۔ درانحالیکہ دائن کو حکومت کی طرف سے یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ وہ قانوناً اپنی سودی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس سرمایہ پر جو بے کار پڑا ہو زکوٰۃ عاید کی گئی ہے۔ اسلام پیدائشِ دولت اور تجارت کو فروغ دینے کا خواہاں ہے اور یہ چیز اکتناز کے خلاف اس کے تمام سخت احکام کی تشریح کرتی ہے۔ اندوختہ دولت کا ایک حصہ حکومت لے لیتی ہے اور اسے اجتماعی فلاح و بہبود خاص کر غریب طبقوں کو مدد دینے میں خرچ کرتی ہے۔ مملکت خیر و فلاح کو انسانی محنت اور قدرتی ذرائع سے نفع اٹھا کر پیدائشِ دولت کی ہمت افزائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس کو اس سے بھی باخبر رہنا پڑتا ہے کہ دولت ساری ہیئتِ اجتماعیہ میں سرایت کیے ہوئے ہے اور کسی حصہ میں بے جا فراوانی اور کسی دوسرے حصہ میں بے انتہا کمی کا باعث نہیں رہی ہے۔ قرآن آگاہ کرتا ہے:

کیلا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم ـــ خبردار! دولت صرف مالداروں میں گردش کرتی نہ رہے۔ (حشر ـ ۷)

بے محنت کے کمائی ہوئی دولت زیادہ تر سود اور فاضلات کے اکتناز سے جمع ہوتی رہتی ہے۔ یہ وراثت کے غیر منصفانہ قوانین یا کسی ایک کو تمام جائداد

کی وصیت سے بھی جمع ہوتی ہے۔ حق ملکیت اور ذاتی جائداد کے اصول کو پیش کر کے اسلام نے ایک طرف ناواجبی دولت کے اکتناز اور دوسری طرف افلاس کے خلاف ضروری تحفظات کر دیے ہیں۔ تمام بڑے مذاہب نے ہمیشہ خیرات پر بہت زور دیا ہے۔ اور بخیل و بے حس مالداروں کو مطعون کیا ہے۔ لیکن یہ اسلام ہی تھا جس نے منصفانہ تقسیم دولت کے مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ عملی طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی۔ انسانی فطرت کا اندازہ کر کے اس نے یہ دریافت کر لیا کہ محض اخلاقی پند و موعظت سودمند نہ ہوگی، جب تک کہ قوم کا معاشی نظام ضروری قوانین کے ذریعہ از سر نو ترتیب نہ دیا جائے۔ مذہبی عقیدہ اور اس کا زبانی اقرار ناکافی ہے۔ قرآن میں نیک لوگوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں خیرات پر بحیثیت اصل نیکی کے زور دیا گیا ہے۔ پھر خیرات کی ارادی اور جبری خیرات میں تقسیم کی گئی ہے۔ اپنی خوشی سے خیرات کرنے کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ نیکوکار اپنی ضرورت سے زائد کوئی چیز نہیں رکھتے۔ وہ اندوختہ نہیں کرتے بلکہ اپنی زائد دولت کو خرچ کرتے ہیں۔ زکوٰۃ جس کی وصولی کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے، ہر قسم کی مصیبتوں کے لیے ہے۔ اسلام کے اہم ارکان میں سے یہ ایک ہے جس کا بیان قرآن میں اکثر نماز کے ساتھ اس تنبیہ سے کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی عبادتیں جو خیرات نہیں دیتے خدا کے پاس بے اثر اور ناقابل قبول ہیں۔ اپنے گرد و پیش کی معاشی زندگی پر نظر فرما کر آنحضرتؐ نے متعدد موقعوں پر اس امر کی صراحت فرمائی کہ کس مقدار سے اوپر فاضل دولت شمار کی جائے، اور کس حد تک اس پر محصول عائد کیا جائے۔ اگر معاشرہ کے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں تو ہمیشہ منصوبہ کے اقتضا اور مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس کی جزئیات میں حالات کی مناسبت سے مطابقت دی جا سکتی ہے۔ اسلام کی رو سے جمع شدہ فاضل دولت اخلاقی اور معاشی مضرت کا موجب ہوتی ہے، اور

غریب، مفلوک الحال بے بس لوگوں کے اخلاق بگاڑ دیتی ہے۔ جس سے پورا معاشرتی نظام فاسد ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی پاکی اور نیز افزونی اور بخشش و رحمت کے ہیں۔ جو جماعت اس کی پابندی کرتی ہے وہ پاک ہوتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ کیونکہ اصلی خوش حالی بجز اجتماعی صحت مندی کے اور کچھ نہیں۔ معاشی زندگی کی کارکردگی اور ترقی کا دارومدار اسی پر ہے۔ یہ مسلمانوں کے بیت المال کا محور ہے۔ آنحضرتؐ کو تموّل اور افلاس دونوں سے اندیشہ تھا۔ آپؐ نے غربت و افلاس کے انسداد کو اسلام کے اہم مقاصد میں سے بیان فرمایا ہے۔ متعدد دیگر مذاہب نے افلاس کی مدح سرائی کو روحانیت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ یہ اندازِ فکر افلاس اور سادہ زندگی میں خلطِ مبحث کا نتیجہ ہے۔ سادہ زندگی کی آں حضرتؐ نے توصیف فرمائی، اور اس پر عمل کر کے دکھلایا۔ لیکن افلاس کے متعلق آپؐ نے خدا سے دعا فرمائی کہ اسے انسانوں سے دُور رکھے، جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے:

الفقر سواد الوجہ فی الدارین — افلاس دونوں جہانوں میں موجب روسیاہی ہے

جس کے سبب بعض دفعہ ایمان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ آپؐ دولت کی افزونی سے ہراساں تھے۔ یہ روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "مسلمانو! مجھے تمہارے افلاس سے زیادہ تمہارے تموّل سے اندیشہ ہے۔" آپؐ کے بعد جب ایران فتح ہوا، اور بیش قیمت مالِ غنیمت کے انبار حضرت عمرؓ کے سامنے لگائے گئے، تو آپ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ کسی نے دریافت کیا "اے امیر المومنینؓ! یہ محل شادمانی اور مسرت کا ہے نہ کہ غم واندوہ کا۔" اس پر خلیفہ نے ارشاد فرمایا "مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اسلام کے لیے خطرہ نہ ثابت ہو۔" یہ اظہارِ خیال اسلام کے ان مخالف اور جاہل نکتہ چینوں کی آنکھیں کھول دے گا جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ مالِ غنیمت کی محبت سابقین اسلام کی جنگ آزمائیوں کا بھی اصلی محرک بنی ہوئی تھی۔

زکوٰۃ کا آئین جو اسلامی مملکتِ خیر کا ایک محوری نقطہ ہے اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے "صرف زکوٰۃ کی ادائی ہی میں تمھارے اسلام کو پناہ مل سکتی ہے۔ اپنے مال و دولت میں سے زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ تمھیں پاک و صاف بنائے گی۔ اور تمھیں ان کا حق ادا کرنے کے قابل بنائے گی جو تمھارے رشتہ دار ہیں۔ سائل، ہمسایہ اور مسکین کے حقوق سے باخبر رہو، اور فضول خرچی میں مبتلا نہ ہو۔" "جو قوم زکوٰۃ کو موقوف کر دیتی ہے، وہ قحط و فلاکت سے ہم آغوش ہوتی ہے۔" "بغیر زکوٰۃ کے اللہ کے نزدیک نہ ایمان قابلِ قبول ہے نہ عبادت۔"

کوئی مملکت اسلامی مملکت کہلانے کی مستحق نہیں، اگر وہ زکوٰۃ کے احکام سے بے اعتنائی برتتی ہے۔ کیونکہ اسلام کی رو سے مملکت کا مقصد بجز اجتماعی فلاح و بہبود کے اور کچھ نہیں، اور اجتماعی فلاح بغیر زکوٰۃ کے ناممکن ہے۔ اگر انفرادی حق قانون سازی اور ذاتی ملکیت کو انفرادی آزادی میں بطور ایک ضروری عنصر کے شامل کیا جائے۔ لیکن یہ نظام بلا اصلاحی محاصل کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، تو بعض لوگ یقیناً اپنی حاجت سے زیادہ اس کو حاصل اور جمع کر لیں گے، اور دوسرے بے نوائی اور افلاس میں چھوڑ دیے جائیں گے۔ اس لیے طریقۂ تحصیل اور تقسیم دولت پر حکومت کا اختیار اور قابو ہونا چاہیے۔ اسلام کی سیاسی کامیابی کے بعد بعض عرب قبائل اسلامی مملکت کے حلقۂ اثر میں بلا اسلام کی روح کو بخوبی سمجھے اور اخذ کیے بسرعت داخل ہونا شروع ہوئے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب وہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایمان لے آئے ہیں تو ان سے کہا جائے کہ انھوں نے صرف اسلام کی قوت کے آگے اپنا سرِ اطاعت جھکا دیا ہے اور ایمان تو ایک قلبی اثر پذیری کا معاملہ ہے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد ایسے متعدد قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور عدم ادائیگی محصول کی مہم شروع کر دی۔ آنحضرتؐ کے جانشین متحیر تھے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے جو خود

کو مسلمان کہتے ہوں، خدا کی وحدانیت پر ایمان لاتے ہوں، اور نماز ادا کرتے ہوں، اور خلیفہ کس طرح اہلِ ایمان کے خلاف برسرِ جنگ ہو سکتا ہے؟ ابتداءً یہ خیال حضرت عمرؓ جیسے مضبوط ارادہ رکھنے والے لوگوں کا بھی تھا۔ لیکن اس خصوص میں آنحضرتؐ کے خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکرؓ اسلام پر ایک صاف اور واضح مدبرانہ نظر رکھتے تھے آپ کا خیال تھا کہ بغیر زکوٰۃ کے ایمان نامکمل رہتا ہے۔ نماز بیں ادا کرنا لیکن بہبودِ عامہ میں حصّہ نہ لینا اور اس کے لیے ایثار اور قربانی نہ کرنا فی الواقع ایمان کی نفی و انکار ہے۔ آپ نے فرمایا میں ان سے لڑوں گا جنھوں نے اس محصول کی ادائیگی سے انکار کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی آپ کی اعلیٰ بصیرت اور اٹل فیصلہ کی داد دی اور واقعۃً ایک خوں ریز جنگ اس مقصد کے تحت لڑی گئی۔ مقامِ افسوس ہے کہ مابعد زمانوں میں یہ لازمی محصول جو فلاحی مملکت کا سرمایۂ قوت تھا اور جس کی تحصیل و تقسیم مملکت کے ذریعہ ہونی چاہیے تھی، اختیاری بن کر رہ گیا اور اس کو ادا کرنے والے کے ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیا گیا۔ مغرب کی معاشیات عدمِ مداخلت نے معاشی توازن پیدا کرنے کے لیے افراد کی روشن خیال خود مطلبی پر اعتماد کیا تھا، اور اب اس چیز کو دنیا جانتی ہے کہ ان وجدانات کے غلط مطالعہ نے کیا افراتفری برپا کر رکھی ہے۔ خود مطلبی ایسی روشن خیال ثابت نہیں ہو سکتی کہ انفرادی اور اجتماعی مفادات کسی من جانب اللہ انتظام سے ایک دوسرے کے موافق ہو جائیں۔ مسلمان مملکتوں نے جو زکوٰۃ کے معاملہ میں مسلمانوں کے ایمان پر اعتماد کیا تو وہ غلطی کی مرتکب ہوئیں۔ حکومت کے اختیار و قابو سے نکل کر زائد سرمایہ بیت المال میں جمع نہ ہو سکا، اور بہت سے فلاح و بہبود کے منصوبے بھی انفرادی ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیے گئے۔ اسلام نے پیدائش و تقسیم دولت کے انتظام کی ذمہ داری حکومت پر عائد کی تھی۔ اسلامی حکومت کو ہمہ گیری عفریت بنے بغیر اس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ قانون سازی کا اہم مسئلہ حکومت کی مداخلت اور فرد کی آزادی دونوں کے حدود کے تعین کے لیے ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کو ایک دل پذیر اور سہل العمل طریقہ پر حل کیا ہے۔ لیکن مسلمان مملکتوں نے خود اس تجویز کو غارت

کر دیا۔ زکوٰۃ ایک محصول ہے جو سرمایہ پر عائد کیا جاتا ہے۔ یہ دولت کو ان حصوں میں گردش کراتا ہے جو اس کے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ دولت کی ربط وہی اجتماعی فلاح و بہبود کے ساتھ کرتی ہے، اور یہ اصول عدم مداخلت کی نقیض ہے۔ مسلمان مفکرین اور مشہور عالمانِ دین، اخلاقی پاکیزگی اور عام خوش حالی کے لیے زکوٰۃ کی اہمیت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ یہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایک عبارت پیش کی جاتی ہے جو اسلام کے ایک ولی صفت مفکر تھے۔ فرماتے ہیں: "اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی سوءِ فہم نہ ہونا چاہیے کہ زکوٰۃ کا حکم دو مقصدوں کی تکمیل کے لیے دیا گیا ہے: ایک تادیبِ نفس، اور دوسرے بے نوائی کے خلاف فراہمی اسباب۔ مال و دولت، بخل، خودغرضی، باہمی عناد، نفرت اور اخلاقی تنزل پیدا کرتی ہے۔ ان خرابیوں کا بہترین علاج مال و زر کی فیاضانہ بخشش و عطا ہے۔ اس سے بخل کا استیصال اور خودغرضی کا علاج ہوتا ہے۔ یہ معاشی رخنوں کو پر کرتی اور اس کی جگہ جذبۂ رفاقت پیدا کرتی ہے۔ یہ رفاقت اعلیٰ اخلاقی کردار کا سنگِ بنیاد بن جاتی ہے۔ جب یہ نشوونما پاتی ہے، تو ایماندارانہ سلوک کے عادات کی پرورش کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ لیکن یقین کے ساتھ یہ شریفانہ اوصاف انسان کو اخلاقی برتری کا نمونۂ اخلاق بنا دیتے ہیں۔ اس کے معنی تادیبِ نفس کے ذریعے اصلاحِ ذات کے ہیں۔"

زکوٰۃ قومی اور معاشری افلاس کے خلاف ایک نہایت موثر تدبیر ہے۔ کیونکہ ایک شہری بنا اس وقت تک محکم نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ کسی درست معاشی اساس پر استوار نہ ہو۔ ایک سوسائٹی اپنے معاشی نظام ہی کے ذریعہ اپنے محتاج اراکین کی ضرورتوں اور حاجتوں کا ان کی حیثیت کے مطابق انتظام کر سکتی ہے۔ وہ گداگری کو پھیلنے سے روکتی ہے۔ کیونکہ نادار، معذور، اپاہج، یتیموں اور ایسے ہی محتاجوں کے دیگر تمام قبیل کی مناسب طریقہ پر نگہداشت کی جاتی ہے، اور انھیں بھیک مانگنے کی ذلت اور بے عزتی سے بچایا جاتا ہے۔ یہ مملکت ہی کا کام ہے اور اس کو ان لوگوں کی پرورش و پرداخت کا کفیل ہونا چاہیے۔ مگر یہ پوری کفیلی ذمہ داری اسی وقت

قابلِ اطمینان طریقہ پر انجام دی جا سکتی ہے جب کہ حکومت کے معمولی ذرائع آمدنی کے ساتھ زکوٰۃ کی صورت میں ایک معتد بہ رقم دولت مندوں سے حاصل ہوتی رہے۔

قرآن نے چند ایسے طبقوں کے نام گنئے ہیں جو زکوٰۃ کی رقم سے امداد و اعانت کے مستحق ہیں:

انما الصدقات للفقراء و المساکین والعاملین علیھا والمؤلفۃ قلوبھم و فی الرقاب والغارمین و فی سبیل اللہ وابن السبیل ط فریضۃ من اللہ ط واللہ علیم حکیم ۝ (التوبہ ۔۔ ۶)

خیرات غربا و مساکین کے لیے ہے اور ان کے لیے جو اس کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جو جدید الایمان ہیں، اور ان کے لیے جو غلامی اور قرض میں ہیں، اور یہ راہِ حق میں خرچ کرنے اور مسافروں کے لیے ہے، یہ خدا کا حکم ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

غریب اور محتاج کے دو لفظ اس قدر جامع ہیں کہ ان تمام حالتوں کی فہرست بنانا ناممکن ہو جائے گا جن میں انسان ضروریاتِ زندگی کے لیے اعانت کا خواستگار ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے محتاجوں کی قبیل میں نہ صرف ملازمت کے نااہل لوگوں کو بلکہ بے روزگاروں کو بھی شامل فرمایا ہے۔ یعنی ایسے لوگ جو کام کر سکتے ہیں۔ لیکن جنھیں کام نہیں ملتا۔ ان میں سے ایک قسم خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ آنحضرتؐ انسانیت کو زبردست آزادی دلانے والے اور اس کے سخت آرزومند تھے کہ غلامی کے رواج کو برخاست کر دیا جائے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ کسی غلام کو آزاد کرنا انتہا درجہ قابلِ قدر عمل ہے۔ چونکہ قدیم تہذیبوں کا جملہ معاشی نظام غلامی کے رواج پر قائم تھا۔ اس لیے بیک جنبشِ قلم اس کو ختم کرنا ناممکن تھا۔ چند اعمال کے ارتکاب اور ترکِ فعل کے کفارہ میں بطور تدبیر کے غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ غلاموں کے ساتھ رفق و ملاطفت کا سلوک کرنے کے لیے آقاؤں سے پُرجوش اپیلیں کی گئیں۔ لیکن اس اصول کی رو سے کہ حکومت تمام اہم معاملات کو افراد کے آزادانہ حق قانون سازی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے لے، مملکت پر یہ چیز بھی لازم کر دی کہ وہ اپنی آمدنی کا

ایک حصہ غلاموں کی آزادی پر صرف کرے۔ حکومت کو اس شخص کی بھی اعانت کرنی چاہیے جو قرض میں گھرا ہوا ہو اور بدقسمتی سے اس حالِ زار میں مبتلا ہو گیا ہو۔ غیر مفید قرض داری سے رہائی بخشنا بھی حکومت کا ایک فرض ہے۔ فی سبیل اللہ کی اصطلاح رفاہِ عامہ کے تمام اعمال پر حاوی ہے۔

(ثقافت، جولائی ۱۹۵۷ء)

اسلام اور جمہوریت

اکثر مغربی ممالک میں اب نظامِ مملکت جمہوری ہے۔ لیکن جمہوریت ایک کلی تصور ہے جس کے کئی پہلو اور کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً سیاسی جمہوریت، معاشی جمہوریت معاشرتی جمہوریت۔ ہو سکتا ہے کہ کسی قوم میں ان میں سے ایک کا وجود ہو اور دوسری اقسام مفقود ہوں۔ سیاسی جمہوریت وہاں پائی جاتی ہے جہاں دستورِ مملکت عوام کی مرضی سے بنایا گیا ہو اور آزادانہ طور پر عوام کے منتخب نمائندے ایک مجلس شوری میں دستور وضع کر سکیں اور آئین و قوانین میں حسب ضرورت رد و بدل کر سکیں۔ معاشی جمہوریت وہاں پائی جاتی ہے جہاں دولت کی افزائش و آفرینش نے قوم کو مختلف طبقات میں تقسیم نہ کر رکھا ہو۔ جہاں جاگیرداری اور سرمایہ داری نے قوم کی دولت کو چند افراد کے ہاتھوں میں مرتکز نہ کر دیا ہو۔ معاشرتی جمہوریت وہاں ہو گی جہاں مذہب یا نسل یا رنگ یا زبان کے فرق و امتیاز نے برتری اور کہتری پیدا نہ کی ہو اور جہاں سوسائٹی میں تمام افراد کے میل جول میں تعصبات کی دیواریں حائل نہ ہوں۔ در اصل دین کامل کی طرح جمہوریت بھی ایک نصب العین ہے اور کسی قوم کی زندگی بھی پوری طرح اس کے مطابق نہیں ملتی۔ انگریزوں کو دیکھیے کہ ان میں بادشاہی بھی ابھی تک موجود ہے، دارالامرا کا ادارہ ہے جس کے اراکین کو عوام منتخب نہیں کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ دارالعوام بھی ہے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری پر وہاں تاریخی ارتقا نے کافی کاری ضربیں لگائی ہیں لیکن ابھی تک ان جلی ہوئی رسیوں کے بل باقی ہیں۔ مغرب میں لوتھر کی اصلاحِ کلیسا سے لے کر آج تک کئی ہیجان خیز انقلاب ہوئے ہیں اور ہر انقلاب میں جمہوریت دو قدم آگے بڑھی

ہے لیکن منزلِ مقصود کو کوئی قوم نہیں پہنچی ۔ آغازِ اسلام کا انقلاب ایک ہمہ گیر تغیرِ حیات کا متقاضی تھا اور ان تمام تغیرات کی رفتار کا رخ جمہوریت کی طرف تھا۔ لیکن بہت جلد قدیم روایات پھر اُبھر آئیں۔ خلافت سلطنت میں تبدیل ہو گئی سرمایہ داری، زمینداری، جاگیرداری اور غلامی پھر عود کر آئی اور وہ اندازِ فکر و عمل رخصت ہوا جس نے بلال حبشی کو سردارانِ قریش کا ہم رنگ بنا دیا تھا۔ فتوحات کی بدولت جو دولت ہاتھ آئی وہ ایک محدود اور مخصوص طبقے میں سمٹتی گئی۔ اسلامی تعلیم، قرآنی تلقین اور رسولِ کریمؐ کا میلانِ طبع اور طرزِ عمل غلامی کا بتدریج قلع قمع کر دیتے۔ لیکن فتوحات کے نشے میں مسلمان یہ سب کچھ بھول گئے اور ہمارے بعض جدید علمائے کرام کی طرح یہ کہنے لگے کہ اسلام نے غلامی کو منسوخ تو نہیں کیا فقط ان سے رحم کا برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ایک حکیم مغربی نے سچ کہا ہے کہ دین سے قوت پیدا ہوتی ہے اور پھر قوت ہی دین کو فنا کر دیتی ہے۔ رسولِ کریمؐ اپنی نادار قوم کے لیے خدا سے زندگی کی بنیادی ضرورتوں اور آسائشوں کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی ان کی خداداد بصیرت اس خطرے سے بھی آگاہ تھی کہ دولت کی فراوانی مسلمان کے ایمان و اعمال کی تخریب کا باعث بن جائے گی۔ چنانچہ حدیثِ نبوی سے یہ بھی ملتا ہے کہ مجھے مسلمانوں کے افلاس سے اس قدر ڈر نہیں لگتا جس قدر کہ ان کی دولت مندی سے۔ اسلام کی قوت کی بدولت جس کا ظہور میں آنا ناگزیر معلوم ہوتا تھا۔ یہی اندازِ نگاہ صحابۂ کرام کا بھی تھا۔ چنانچہ کسریٰ کا خزانہ اور قیمتی مال و اسباب، جو کسی عرب کے خواب میں نہ آیا تھا، جب فتح ایران کے بعد مدینے کے بازار میں لاکر ڈھیر کر دیا گیا تو حضرت عمر فاروقؓ کی آنکھوں میں سے آنسو ٹپکتے دکھائی دیے۔ یہ آنسو اشکِ مسرت نہ تھے بلکہ اپنی متاعِ عزیز یعنی اسلام کی تخریب کے خطرے سے آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں کسی نے پوچھا کہ یہ تو مقامِ مسرت ہے آپ آبدیدہ کیوں ہو رہے ہیں۔ آپ

نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ یہ دولت اسلام اور مسلمان کو اس کے مقصودِ حقیقی سے ہٹا دے گی۔ اس خطرے کو حضرت ابوذرؓ نے نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ مگر اربابِ اقتدار نے ان کو خبطی سمجھا۔ جن کے گھروں میں زر و جواہر کے خزانے جمع ہو رہے تھے، انھوں نے کہا کہ اڑھائی فی صد زکوٰۃ کے بعد باقی لامحدود دولت اندوزی حلال ہے۔ یہ کیفیت خلافتِ راشدہ کے زمانے ہی میں پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے دوازدہ سالہ عہدِ زریں میں تو حُبِ مال و جاہ کو ابھرنے کا موقع نہ ملا لیکن حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں معیشت اور معاشرت کا رخ پلٹنے لگا۔ امیر معاویہ نے تمام بیت المال کو اپنی جیب میں ڈال لیا تھا اور محصولات کو اپنی سیاسی قوت کے استحکام کے لیے صرف کرتے تھے چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ مدینے کا ایک شہری ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی پریشانیوں کا ذکر کرکے ان سے کچھ مال طلب کیا تو امیر معاویہ نے خزانچی سے کہا کہ اس کو ایک لاکھ درہم دے دو۔ اس گدائے مبرم کو اتنی رقم کے حصول کے بعد بھی تکرار میں کچھ شرم نہ آئی۔ اس نے کہا کہ جناب اتنی رقم سے کیا ہوتا ہے۔ اس پر حکم ہوا کہ اسے ایک لاکھ درہم اور دے دیئے جائیں۔ جب وہ رقم لے کر چل دیا تو خزانچی نے ادب اور استعجاب سے عرض کیا کہ ایک معمولی شخص کے ساتھ آپ نے ایسی غیر معمولی فیاضی کیوں برتی۔ امیر معاویہ نے فرمایا کہ تم سیاست کو نہیں سمجھتے۔ میں نے یہ رقم اس ایک فردِ واحد کو نہیں دی بلکہ مدینے کی کثیر آبادی کو دی ہے۔ یہ رقم آخر مدینے ہی میں خرچ ہو گی۔ گھر گھر ہماری فیاضی اور سخاوت کا چرچا ہو گا، اور لوگوں کی طبیعتیں ہماری طرف مائل ہوں گی۔

مطلق العنان حکومت ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور اخلاقی تخریب کا سرچشمہ اور تمام اقدارِ حیات کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ ملتِ اسلامیہ میں اس وقت سے آج تک جو بے عنان سلطانی اور شہنشاہی کا دور چلا اس کو تھامنا ایسا ہی محال ہو گیا جیسے کوئی شخص سیلاب کو ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کرے۔ مسلمان

تیرہ صدیوں میں بھی غلامی کو منسوخ نہ کر سکے۔ نظامِ سلطانی کے خلاف کبھی کوئی تحریک پیدا نہ ہوئی۔ مفتوحہ ممالک میں بڑی بڑی جاگیرداریاں پیدا ہو گئیں۔ علما کی زیادہ تعداد یا ظاہری عبادات میں یا معاملات کے بارے میں فقہی اختلافات میں الجھی رہی اور ان علما کا کام جو سلطنت سے وابستہ تھے یہی رہ گیا کہ سلاطین کے ہر فعلِ قبیح کے جواز کے لیے سند تلاش کریں اور فتوے دیں۔ رموزِ سلطنت میں نہ عوام کا دخل رہا اور نہ علمائے دین کو اصلاحِ معیشت و سیاست سے کوئی تعلق۔ اسلامی کہلانے والی سلطنتوں کے فقط یہی معنی رہ گئے کہ وہاں حکمران اور امرا، وزرا، اسلام کے نام لیوا ہیں۔ اسلام نام کے لیے رہ گیا، کام کے لیے نہ رہا۔ اجتماعی زندگی کو سنوارنے اور عادلانہ نظام قائم کرنے کی طرف کسی کو توجہ نہ رہی۔ اسلامی تاریخ زیادہ تر فاتحین کی اکھاڑ پچھاڑ رہ گئی۔ ع ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند۔ جو شخص ظالم ہو یا فاسق و فاجر، تخت نشین ہو گیا اس کی قصیدہ خوانی شروع ہو گئی۔ اس قصیدہ خوانی نے صرف شاعری ہی کو جھوٹ اور مبالغے کا طومار نہیں بنایا بلکہ تمام قوم کو ریاکاری اور دروغ بافی کی تعلیم دی۔ مسلمان اپنے بادشاہوں کی شان و شوکت پر فخر کرنے لگے۔ اس اندازِ نگاہ کا اثر ایسا ہمہ گیر ہے کہ زمانۂ حال میں بھی علامہ اقبال جیسا محی الملت شاعر و مفکر بھی دکن کے قطب شاہی سلاطین کے گورستان پر ایک موثر نظم لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے شاہوں کو یہ اُمت بھولنے والی نہیں۔ اور حفیظ جالندھری تاریخِ اسلام کو منظوم کرنے بیٹھتا ہے تو اس کا نام شاہنامۂ اسلام رکھتا ہے۔ فردوسی کے ہاں تو شاہنامے کا عنوان ضروری اور درست تھا لیکن اسلام کو شاہی سے کیا تعلق؟ شاہی سے زیادہ کوئی چیز اسلام کی منافی نہیں ہو سکتی۔ حسنِ اتفاق سے یک فی صد کبھی کوئی بادشاہ بھی مردِ مومن اور سلطانِ عادل نظر آتا ہے لیکن یہ انسٹی ٹیوشن سراسر غیر اسلامی ہے۔ رسولِ کریمؐ کو کسی نے ملک کہہ کر مخاطب کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں ملک یا سلطان نہیں ہوں اور ایک حدیث شریف میں ہے کہ شاہنشاہ کا لقب خدا کے نزدیک کسی انسان کے لیے حد درجہ مکروہ لقب ہے۔

تاریخی لحاظ سے یہ امر ناقابلِ تردید ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد بہت جلد اسلامی انقلاب کے خلاف ایک ردِّ عمل ہوا جس کی وجہ سے اسلام کے اصلی مشن کی تکمیل دشوار ہوگئی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ تاریخی حیثیت سے اسلام بالکل ناکام رہا۔ تاریخ اس کی تو شاہد ہے کہ مسلمان پانچ سات صدیوں تک تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں دیگر اقوام کے مقابلے میں پیش پیش اور ارتقا کوش رہے۔ اس کی وجہ محض ملکی فتوحات نہیں ہوسکتیں۔ ملکی فتوحات تو علوم و تہذیب سے معرا رہنے والی اقوام نے بھی کیں۔ اس ترقی کا اصلی محرک اسلام کے زاویۂ نگاہ کا وہ حصہ تھا جو ردِّ عمل کے بعد بھی کارفرما رہا۔ مسلمانوں نے غلامی منسوخ نہ کی لیکن غلاموں کے ساتھ وحشیانہ اور انسانیت سوز سلوک کا خاتمہ کردیا۔ یہاں تک کہ غلام آقاؤں کے معلم، وزراء بلکہ سلاطین بن گئے۔ غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی رواداری اسلامی ملت کا شعار بن گئی۔ مظاہرِ فطرت پر غور و خوض کو قرآن کریم نے عبادت میں داخل کردیا تھا۔ رسولِ کریمؐ نے عالم کو عابد پر ترجیح دی تھی اور عالم کی دوات کی روشنائی کو خونِ شہید سے افضل قرار دیا تھا۔ تحصیلِ علوم میں گہوارے سے لے کر قبر تک مسلسل کوشش کو دین کا جزو بنادیا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ علم کی تلاش میں چین تک بھی سفر کرنا پڑے تو اس میں کوتاہی نہ کرو۔ پڑھنے لکھنے والے جنگی قیدیوں کے لیے مسلمان بچوں کو نوشت و خواند سکھانا قید سے رہائی کا فدیہ بنادیا تھا۔ زندگی کی زینتوں کو انسانوں کے لیے حرام نہیں کیا تھا۔ بشرطیکہ وہ ظلم سے پیدا نہ ہوں۔ سینٹ پال کا ادیب و مورخ ڈین انج اپنے مجموعۂ مضامین "آوٹ اسپوکن ایسیز" میں دینی حکومتوں اور ملتوں کے نظریاتِ حیات کا ذکر کرتے ہوئے اس کا اقرار کرتا ہے کہ مسلمانوں میں اپنے دینی جذبے کے باوجود علوم کی جو شدید پیاس پیدا ہوگئی تھی وہ دینی ملتوں میں ایک مستثنیٰ چیز ہے۔

مسلمانوں میں سیاسی جمہوریت بہت جلد ناپید ہوگئی اور معاشی جمہوریت کی طرف انھوں نے خاص توجہ نہ کی لیکن اسلام کی تعلیم کے باقیاتِ صالحات میں سے ایک چیز مسلمانوں میں دیگر ملتوں کے مقابلے میں ہمیشہ نمایاں رہی۔ یہ جمہوریت کا وہ پہلو

ہے جسے سوشل ڈیموکریسی یا معاشرتی جمہوریت کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے نسل کے امتیاز کو اگر پوری طرح مٹایا نہیں تو اس کو اس قدر کمزور اور مدھم کر دیا کہ مختلف نسلوں کے مسلمان گورے، کالے، زرد، سانولے سب میں یک رنگی اور یک آہنگی کا شعوری یا تحت الشعوری جذبہ ہر حالت میں کم و بیش قائم رہا۔ ہمارے نزدیک اسلام نے نوع انسان پر جو احسانات کیے ہیں ان میں سے یہ احسان، احسانِ عظیم ہے۔ دنیا میں اشاعت اسلام کی حیرت انگیز سرعت کے اسباب مغرب کے غیر مسلم مستشرقین کی سمجھ میں نہیں آتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تعصب نے ان کی تاریخی بصیرت میں خلل ڈال دیا ہے۔ اکثر ایک ہی جھوٹ کو الاپتے رہتے ہیں کہ اسلام دنیا میں بزورِ شمشیر پھیلا۔ تاریخ کا بے لاگ مطالعہ اس بہتان کو رفع کر دیتا ہے۔ دنیا میں ایسے خطے موجود ہیں جہاں مسلمانوں کی سیاسی قوت کم و بیش ہزار سال تک بے مزاحمت باقی رہی لیکن وہاں مسلمانوں کی آبادی کی کثرت نہیں ہے۔ یورپ کے مشرق اور مغرب میں مسلمانوں نے سینکڑوں برس بڑے جمال و جلال کے ساتھ حکومت کی لیکن وہاں مسلمان اقلیت میں ہی رہے۔ کیونکہ دین کے بارے میں جبر کو قرآن نے ناجائز قرار دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ایسے خطے موجود ہیں جہاں مسلمانوں کی قومی مملکت قائم نہیں ہوئی لیکن وہاں کی کثیر آبادی مسلمان ہے۔ دوسروں کا مذہب یا سیاست کے جبر سے بدل سکتے ہیں اور یا مسلسل اور منظم تبلیغ سے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت کہیں نہیں ملتا کہ مسلمان سلاطین نے جبر کیا ہو یا سلطنت کے ذرائع کو تبلیغ میں استعمال کیا ہو۔ مسلمانوں میں نہ کوئی منظم کلیسا تھا اور نہ مشنریوں کے گروہ جن کو حکومتوں سے یا سرمایہ داروں سے مدد ملتی ہو۔ ایسی کوششوں کے فقدان کے باوجود اسلام انڈونیشیا جیسے وسیع خطے میں پھیلا تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس کی دو ہی وجوہ ہو سکتے ہیں، ایک اسلام کی سادہ صداقتیں اور دوسرے بے امتیاز نسل و رنگ برادری اور برابری کا احساس۔ عرصہ ہوا ایک مرتبہ راقم الحروف کو کلکتہ میں بنگال کے مشہور کیمیادان سائنٹسٹ سر پی۔ سی۔ رائے سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک

وسیع المشرب اور بے تعصب انسان تھے اور غالباً برہمو سماج کے پیرو تھے۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ جو کوئی یہ کہتا ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا وہ نہایت مکروہ جھوٹ بولتا ہے۔ فرمانے لگے کہ بنگال ہی کو دیکھ لو کہ میرے ایامِ شباب میں یعنی کوئی نصف صدی پیشتر مسلمانوں کی سیاسی قوت بنگال میں صفر ہو گئی تھی۔ ان کے پاس معاشی قوت بھی نہ رہی تھی اور مسلمان اس فقدانِ قوت کے دور میں بنگال میں اکثریت نہ تھے بلکہ اقلیت تھے لیکن اس نصف صدی میں میرے دیکھتے دیکھتے ان کی تعداد ہندوؤں سے بڑھ گئی ہے۔ یہاں کس نے تلوار ماری ہے۔ فرمانے لگے اس کا واحد سبب اسلامی اخوت، برابری اور برادری کا احساس ہے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے جن کو اچھوت سمجھ کر جانوروں سے بدتر سلوک کیا وہ انسانی سلوک کے لیے اسلامی برادری میں داخل ہوتے گئے۔

آج کل جمہوریت محض ایک نظامِ حکومت کا نام نہیں رہا۔ بلکہ مذہب کی طرح ایک ہمہ گیر تصور بن گیا ہے اور جس طرح مذاہب کا تصور مبہم اور غیر معین ہو گیا ہے وہی حال جمہوریت کا ہے۔ کمیونزم یا اشتراکیت اور سوشلزم دونوں کا دعوےٰ ہے کہ جمہوریت کی صحیح شکل یہی ہے۔ ممالکِ متحدہ امریکہ میں اکثر لوگ نہ صرف کمیونزم کے خلاف ہیں بلکہ سوشلزم کو بھی اپنی جمہوریت کے منافی سمجھتے ہیں۔ انگلستان میں جب اٹلی کی وزارت میں محنت کشوں کو اکثریت کی بنا پر حکومت کو سنبھالنے اور ڈھالنے کا موقع ملا تو انھوں نے کھلم کھلا سوشلزم کو اپنا مقصود قرار دیا۔ انگلستان اور روس کے سیاسی اور معاشی نظامات میں بعد المشرقین ہے لیکن دونوں سوشلزم کے مدعی ہیں۔ اگرچہ روسی اپنا انتہائی نصب العین کمیونزم بیان کرتے ہیں اور سوشلزم کو ایک منزلِ سرِ راہ قرار دیتے ہیں۔

مسلمان بھی اس کے مدعی ہیں کہ اسلام ایک صحیح اور خالص قسم کی سوشلزم ہے۔ لیکن ان کے ہاں یہ لفظ بہرمندہ معنی نہیں ہوتا۔ ہر شخص جو دینی یا سیاسی رہبری کا آرزو مند ہے وہ عوام کو ہم خیال بنانے اور ان کے جذبات کو اپنے اغراض کے لیے

ابھارنے کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ بعض اسلامی سوشلزم کی مرکب اصطلاح استعمال نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک فقط لفظ اسلام ایک جامع مفہوم ہے اور سوشلزم اس کے اندر مضمر ہے۔ اگرچہ بعض دین و سیاست کو مخلوط کرکے رہنمائی کے مدعی ایسے بھی ہیں جنھیں سوشلزم سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ لامحدود زمینداری اور لامحدود سرمایہ داری کو بھی اسلام کے منافی نہیں سمجھتے۔ بشرطیکہ جن لوگوں نے ناجائز طور پر غاصبانہ یا حکومتوں کی خوشامد یا غداری سے وسیع خطہ ہائے زمین پر قبضہ جما رکھا ہے، وہ زکوٰۃ ادا کر دیا کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قرآن کریم کی اس ہدایت کو بھی دہراتے رہتے ہیں کہ معاشی نظام ایسا ہونا چاہیے جس میں دولت ایک اقلیت کے ہاتھوں میں مرتکز نہ ہو جائے۔ اگر کوئی ان سے کہے کہ تم سوشلزم کے خلاف ہو تو وہ کبھی علانیہ اس مخالفت کا اقرار نہ کریں گے اس لیے کہ سوشلزم کا جمہوری تصور عوام کے دل نشیں ہو چکا ہے اور اس کی کھلم کھلا تردید کرکے عوام سے ووٹ حاصل کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اگر وسیع اور لامحدود زمینداری اور سرمایہ داری کی حمایت نہ کریں تو دولت مندوں سے چندے کی بڑی رقمیں نہ مل سکیں گی، اور نہ وہ ووٹ حاصل ہو سکیں گے جو دولت مند زمیندار اور سرمایہ دار اپنے اقتدار یا دباؤ سے عوام سے حاصل کرتے ہیں اور جن کے نمائندہ بن کر وہ مجلس آئین ساز میں حکمرانی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ایران، اور مصر اور پاکستان اور انڈونیشیا میں بعض مذہبی جماعتیں اسلام کے نام پر ہنگامہ آرا ہیں۔ لیکن اگر ان کے تصورات، عقائد، اور اعمال کا جائزہ لیا جائے تو سوشلزم درکنار معمولی جمہوریت بھی قائم نہیں ہو سکتی۔ کچھ ایسے ہیں جو الارض للہ کا من مانا مفہوم لے کر اپنی سوشلزم کی تمام عمارت اس پر کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں بعض کی سوشلزم ہمہ گیریت (ٹوٹیلٹیرین ازم) کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ان کے خیال میں اگر اشتراکیت کے ساتھ توحید اور رسالت کے اس تصور کو جوڑ دیا جائے جو ان کے نزدیک صحیح ہے تو ایک نصب العینی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ خالی اشتراکیت ہو تو مذہبی لوگ بھڑکتے ہیں لیکن اگر اسے ربوبیت عامہ

کہ وہ تو رب العالمین سے اس کا رشتہ قائم ہو کر وہ عین اسلام بن جاتی ہے۔

اسلام اور جمہوریت یا مخصوص طور پر جمہوریت کی وہ شکل، جسے سوشلزم کہتے ہیں اس کے متعلق دو سوالات نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام اس کا قائل ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس انداز اور کس رنگ میں۔ دوسرے یہ سوال کہ یہ اندازِ سیاست و معیشت کبھی تاریخی حیثیت میں معرضِ شہود میں آیا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس ضمنی سوال کو بھی جوڑ سکتے ہیں کہ اس وقت تمام دنیا میں پھیلے ہوئے اسلامی ممالک میں کہیں جمہوریت یا سوشلزم ہے بھی یا نہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی، جنھوں نے جذبۂ انقلاب ہی میں زندگی گزاری، کچھ عرصہ تک روس میں بھی رہے۔ چونکہ وہ مسلمانوں میں ایک انقلابی عالم شمار ہوتے تھے اس لیے اسٹالین نے بھی ان کو ملاقات کا موقع دیا۔ مولانا نے اس کے سامنے اسلام کے نظریاتِ معیشت و سیاست پیش کیے جن کا انقلابی پہلو اسٹالین کے لیے بھی خوش آئند ہو سکتا تھا۔ سب کچھ سن کر اس پختہ کار ماہرِ سیاست نے مولانا سے پوچھا کہ کونسی قوم یا کونسا ملک اس نظریۂ حیات پر زندگی کو ڈھال رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس وقت تو کوئی مسلمان قوم اس پر کاربند نہیں۔ اسٹالین نے کہا کہ جب کوئی قوم اس پر عمل کر کے اپنا تجربہ دنیا کے سامنے پیش کرے گی تو اس وقت ہم اس کے قابلِ عمل یا قابلِ قبول ہونے کی نسبت کچھ رائے قائم کر سکیں گے۔ مسلمان اس وقت اسلام، جمہوریت اور سوشلزم کے متعلق ژولیدگیِ فکر اور خلطِ مبحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں ابلہ فریبی یا خود فریبی تو ممکن ہے لیکن حقیقت رسی نہیں ہو سکتی

(ثقافت، فروری ۱۹۵۶ء)

انسانِ کاملؐ

اس اہم اور مقدس مضمون پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ازرہ تمہید انسان اور کمال کے تصورات کی نسبت مختصراً کچھ عرض کیا جائے۔ اس کائنات میں مخلوقات کے جو لاتعداد اقسام ہیں ان میں سب سے زیادہ عسیر الفہم ہستی انسان ہے۔ انسان نے خاک و باد و آب و آتش اور مظاہر فطرت کی نسبت بہت کچھ یقینی علم حاصل کر لیا ہے اور اس یقینی علم کی بدولت انسان خارجی فطرت کا مسخر بنتا چلا جاتا ہے۔ لیکن خود اپنی نسبت اس کا علم ابھی ابجد سے آگے نہیں بڑھا۔ اپنی نسبت اس کا علم ابھی تک ظنی ہے۔ مگر جنون کی طرح ظنون کے بھی بے شمار اقسام ہیں۔ انسان نے اپنی نسبت متضاد تصورات قائم کر رکھے ہیں اور اس تضاد کو رفع کرنا مقصودِ عقل و حکمت اور غایت اخلاق و ایمان ہے۔ مگر یہ کام نہایت درجہ دشوار اور محال معلوم ہوتا ہے۔ طبیعی حکمائے مادیین نے انسان کو لامحدود مادی کائنات کا ایک اتفاقی مظہر اور آنی جانی کیفیت قرار دیا۔ ہستی بے مقصود کے بحرِ متلاطم میں چند لمحوں کے لیے ابھرنے اور جلد بے پروا موجوں سے دوبارہ ہم کنار ہونے والا حبابِ ناپائدار۔ زمان و مکان کی آفاقیت کا ایک تغیر پذیر اور بے ثبات شائبہ دوسری طرف آئیڈیالسٹوں نے اس کو مصدر و محورِ ہستی بنا دیا۔ بقول عارفِ رومی:

قالب از ما ہست شد نے ما از و

بادہ از ما مست شد نے ما از و

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ یہ جہانِ بے پایاں بظاہر ہم ایام ہی غرق معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ زمان و مکانِ لامحدود سب کا سب اس ایک جام میں غرق ہے جو انسان کا نفس یا دل ہے۔ مذاہبِ حکما ہوں یا ادیانِ عالیہ سب

کے سب انسان کی متضاد فطرت کو علی الاعلان پیش کرتے ہیں۔ انسان ایک طرف مسجودِ ملائک ہے تو دوسری طرف مردودِ خلائق۔ یہ احسن تقویم والی مخلوق گرتی ہے تو اسفل السافلین کی تاریک گہرائیوں میں پہنچ جاتی ہے، اور اوپر اٹھتی ہے تو اس کے ڈانڈے الوہیت سے جا ملتے ہیں اور تخلقوا باخلاق اللّٰہ کا کٹھن راستہ طے کرنے کے بعد مجاہدہ، اور معرفت اس کو حقیقتِ ازلی کا اس درجہ ہم صفت بنا دیتے ہیں کہ آگ میں پڑے ہوئے لوہے کی طرح بشریت اور الوہیت کا امتیاز دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وہ اس امانت کا امین ہے جس کو قبول کرنے میں ارض و سما لرز گئے لیکن یہ اہم امانت قبول کرنے والا ظلوماً جہولاً دیوانہ بھی ہے۔

بقولِ غالب:

بردہ آرم از امانت ہرچہ گردوں بر نتافت
ریختن مے بر خاک چوں در جام گنجیدن نداشت

یا بقول حافظ:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

کسی نے اس کو مجبورِ محض قرار دیا اور کسی نے اس کو اپنی تقدیر کا معمار تصور کیا۔ میر تقی کہتا ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا

آزاد کا یہ فتویٰ ہے:

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

اس جبر کے مقابلے میں علامہ اقبال کی تلقین خودی ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

منطق خواہ کچھ ہی کہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ اختیار کے بغیر چارہ اور نہ صبر سے گریز۔ انسان کی نسبت جتنی باہم متضاد باتیں کی گئی ہیں ان سب میں ہر ایک جزئی صداقت کی حامل ہے۔ انسان عقل کے جوہر سے مشرف ہے لیکن اس عقل کو عنان گسیختہ جذبات کا غلام بھی انسان ہی بناتا ہے۔ انسان فطرت کا عظیم الشان شاہکار بھی ہے اور فطرت کی سب سے بڑی لغزش بھی۔ قرآن کریم کو اس نظر سے پڑھیے تو اس مخلوق کا عجیب نقشہ نظر آتا ہے۔ از روئے قرآن یہ بھی درست ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت کے مطابق بنایا۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ لیکن یہ انسان ناشکرا لربہ لکنود بھی ہے۔ خلق من عجل جلد باز بھی ہے۔ کبد یا درد و کرب بھی اس کی فطرت کا لازمی جزو ہے۔ انسان کی زندگی کا سودا زیادہ تر گھاٹے ہی کا سودا ہے۔ ان الانسان لفی خسر۔ انسان آزادی کا خواہاں ہے اور دین بھی حریت کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن وہ خود اپنے آپ کو توہمات اور حرص و ہوس کی زنجیروں میں جکڑتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان عقل و ایمان اور جذباتِ شہوانی کی مخالف لہروں میں پڑتا ہوا ایک بھنور رہ جاتا ہے۔

اسلام اور اس کی کتاب حکیم نے انسان کی یہ تمام کیفیتیں بیان کی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ تلقین کی ہے کہ انسان کا وظیفۂ زندگی اور مقصودِ حیات یہی ہے کہ وہ زندگی کے تضاد کو رفع کرتا ہوا مسلسل اس وحدت کی طرف قدم بڑھائے جو مصدرِ حیات و کائنات ہے۔ اس لحاظ سے دین اور حکمتِ عقلی میں کوئی تضاد نہیں۔ دین کی تعلیم بھی یہی ہے کہ تمام ہستی اپنی کثرت و تنوع کے باوجود ایک وحدت سے سرزد ہوئی ہے جو کثرتِ موجودات اور ظاہری تنوع کی شیرازہ بند ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کا یہی گہرا مفہوم ہے کہ ہمارا ماخذ ایک وحدتِ خلاق ہے اور مقصودِ حیات پھر اسی کی طرف عود کرنا ہے۔ کل شییٔ یرجع الی اصلہ ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش　　باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

عقل و حکمت کا بھی یہی وظیفہ ہے کہ مظاہر فطرت خارجی ہوں یا مظاہر نفس انسانی

غرضیکہ ہر جگہ انفس و آفاق میں ان قوانین کی جستجو کرے جن کی نسبت قرآن حکیم نے لاتبدیل لخلق اللہ کہا اور اسی کو دین قیم قرار دے کر دین اور حکمت کو ہم آغوش کر دیا ہے۔ دین ہو یا علم یا اخلاق سب رفع اضداد کی مختلف کوششیں ہیں۔

آیئے اس لحاظ سے اسلام اور اس کے پیش کرنے والے رحیم و حکیم نبی کی تعلیم اور زندگی پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں۔

بہت سے فلسفے اور کئی ادیان زندگی کے ظاہری اور باطنی اضداد سے گھبرا گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ متغیر عالم غیر حقیقی اور فریب ادراک یا مایا ہے اور گیان کے ذریعے سے اس فریب سے نجات حاصل کرنا زندگی کی غایت ہونی چاہیے۔ کسی نے آرزوؤں کی اطمینان ناپذیر کشاکش سے بیزار ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ یہ درد سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے۔ اس لیے اچھی اور بری تمام آرزوؤں کی بیخ کنی ہی سے نروان حاصل ہو سکتا ہے۔ یونانیوں نے کہا کہ عالم حقیقی اعیانِ ثابتہ کا عالم عقلی ہے اور متغیر مظاہر کا عالم بے حقیقت اور بے ثبات ہونے کی وجہ سے قابلِ اعتنا نہیں۔ کسی نے ایک عالم کی بجائے خیر و شر کے آفریدہ دو عالم بنا دیے۔ ان میں سے ایک آفریدۂ یزداں اور دوسرا آفریدۂ اہرمن۔ اسلام نے سورۂ فاتحہ کی پہلی ہی سطر میں ان تمام باطل نظریات کی تنسیخ کر دی خالقِ کائنات کو رب یا پروردگار قرار دیتے ہوئے یہ بتا دیا کہ یہ رب کسی ایک عالم کا رب نہیں بلکہ رب العالمین ہے۔ تمام عوالم ایک ہی خالق کے آفریدہ اور ایک ہی پروردگار کے پروردہ ہیں۔ عالم جماد، عالم نبات، عالم حیوان، عالم انسان، عالم افلاک، عالم ملائکہ ایک ہی ہستی کے آفریدہ ہیں جو رحمان و رحیم ہے۔ رحمانیت میں رحمت کا جو مظہر ہے اس کا تعلق آفرینش سے ہے جس کی نعمتیں اور برکتیں مخلوقات کے اعمالِ حسنہ کا اجر نہیں بلکہ رحمتِ خلاقی کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بعد شانِ رحیمی ہے جس کا ظہور انسانوں کی غلط روی کے بعد ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کی ہر لغزش پر گرفت

اور عذاب ہوتا تو زندگی محال ہو جاتی۔ خدا کے ہاں عدل بھی ہے لیکن اس کی رحمت اس کے عدل کو بھی محیط ہے اسی لیے رب العالمین کو رحمٰن ورحیم کہنے کے بعد مالکِ یوم الدین کہا گیا ہے تاکہ رحمت کی سبقت انسان پر واضح ہو جائے۔ جس طرح اسلام کا پیش کردہ خدا رب العالمین ہے اسی طرح اس کا نبیؐ کامل بھی رحمتِ کلی کا مظہر ہے۔ کئی مذاہب وادیان نے اس کائنات ہی کو ملعون قرار دیا تھا۔ نبیؐ حکیمؐ نے کہا کہ یہ کائنات نہ غیر اصلی ہے اور نہ باطل ومردود۔ ربنا ما خلقت ھذا باطلاً۔ خدا کی رحمتِ کلی کائنات میں جاری وساری ہے وہ کسی ایک عالم تک محدود نہیں۔ حقیقی معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر عالم کو خدا کا ایک مظہر سمجھا جائے اور ہر مظہر میں خدا کی حکمتیں اور نعمتیں تلاش کی جائیں۔ رہبانیت کے مذاہب عالمِ مادی وجسمانی کو ملعون سمجھ کر فکر وعمل میں اس سے نجات حاصل کرنے میں کوشاں تھے اور روحانیت کی تکمیل کے لیے دنیا سے روگردانی اور بدن آزاری کو لازم گردانتے تھے۔ نبی حکیم ورحیمؐ نے یہ اعلان کر دیا کہ لا رھبانیۃ فی الاسلام۔ کوئی انسان دنیا کو رد کر کے نہ روحانیت میں ترقی کر سکتا ہے اور نہ خدا تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ انسان کے مقاصد اور جذبات میں بے شبہ تضاد پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا علاج جذبات کشی سے نہیں بلکہ حدود وعمل سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے تاکہ جذبات کی قوتیں نہ باہم برسرِ کار ہوں اور نہ عقل وایمان سے دست وگریباں ہوں۔ قرآن وحدیث میں کئی جگہ نفسِ امارہ اور جذبات کی سرکشی کے لیے شیطان کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا ایک شیطان لگا ہوا ہے۔ سننے والے صحابی نے پوچھا کہ کیا حضورؐ کے ساتھ بھی ہے۔ اس کا جو بصیرت افروز جواب دیا گیا اسلام کی تمام امتیازی شان اس کے اندر موجود ہے۔ فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی ہے لیکن میں نے اس کو مسلمان بنا کر اس کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ از روئے اسلام دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جسے شرِ مطلق کہہ سکیں۔ زندگی کی اکثر قوتیں خواہ وہ مادی وطبعی

ہوں یا نفسی، بجلی کی طرح بے طرف قوتیں ہیں۔ خیر و شر کا مدار ان کے صحیح یا غلط استعمال پر ہے۔ دیکھیے رسول کریمؐ کی رحمتِ کلی کی تعلیم جس میں جذبات و شہوات کی شیطنت بھی زاویۂ فکر و عمل کی تبدیلی سے معاونِ حیات اور ذریعۂ ارتقا بن سکتی ہے۔

کمالِ صفات کا تصوّر خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ خدا کی ذاتِ کاملہ کا فہم انسان کے لیے ممکن نہیں۔ خدا علیم ہے لیکن اس کا علم انسانی قسم کا علم نہیں ہو سکتا جو مشاہدہ اور استقرا و استخراج اور علت و معلول کے روابط سے آشنا ہونے کا نام ہے۔ وہ سمیع ہے لیکن اس کا سننا اس قسم کی شنوائی نہیں ہو سکتا جو ہمارے آلۂ سماعت کی پیداوار ہے۔ وہ بصیر ہے لیکن اس کی بصارت ہماری آنکھوں کی بصارت کے انداز کی نہیں ہو سکتی۔ وہ رحیم ہے لیکن اس کے رحم میں وہ انفعالی کیفیت نہیں ہو سکتی جو انسان کے جذبۂ رحم میں پائی جاتی ہے:

ہیچ ماہیاتِ اوصافِ کمال　　کس نداند جز بآثار و مثال

ان صفات کا کمال صرف خدا ہی میں ہو سکتا ہے۔ بہت سے ادیان اس غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ پیشوایانِ دین کو کامل ثابت کرنے کے لیے ان کو خدا کے صفاتِ کاملہ سے متصف کر دیا اور ان کو خدا کا اوتار بنا دیا۔ اس غلط انگاری سے نبوّت الوہیت بن گئی۔ ان مذاہب نے یہ نہ سوچا کہ جب خود خدا ہی انسان کا روپ اختیار کر کے دنیا کی ہدایت کے لیے نازل ہو گیا تو انسانوں کے لیے وہ کس طرح نمونہ اور اسوۂ حسنہ بن سکتا ہے۔ انسان کی رہنمائی کے لیے تو انسان ہی کی اعلیٰ امثال کام آ سکتی ہے۔ ان ادیان کے مقابلے میں محمد رسول اللہ کا کمال انسانیت کا کمال ہے۔ یہ ایسے انسان کا کمال ہے جو انسانوں کے سامنے اپنے آپ کو بندۂ خدا کے طور پر پیش کرتا ہے اور خود معبود بننے کا خیالِ باطل اس کے واہمہ میں بھی نہیں گذر سکتا۔ وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ میں عرصۂ دراز تک طالبِ حق اور سوچنے والا انسان تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔ وہ ہدایت یافتہ ہونے کے بعد اپنے آپ کو خدا کا پیغام رساں کہتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہونے کا مدعی نہیں۔ وہ

راست بازی سے کہتا ہے کہ مجھے غیب کا بس اتنا ہی علم ہے جتنا کہ خدا مجھے بخش دے وہ خدا کی معرفتِ کلی کا دعویٰ نہیں کرتا۔ باقی انسانوں کے مقابلے میں بے حد حصولِ بصیرت و معرفت کے بعد بھی ما عرفناک حق معرفتک پکارتا ہے۔ اے خدا تیری ذاتِ مطلقہ کو کما حقہٗ جاننے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ وہ اپنے پیروؤں سے کہتا ہے کہ امورِ دنیا کا علم تم کو مجھ سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ بشریت کے تقاضے سے مجھ سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ ان اعترافات سے کسی مخلص اور راست باز انسان کے کمال میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ درحقیقت کسی انسان کے لیے دعوائے کمال خود نقص کی علامت ہے۔ رسولِ کریمؐ کا کمال بشریت اور عبودیت کا کمال ہے۔ رسولِ کریمؐ خدائے کامل نہیں بلکہ انسانِ کامل ہیں۔ اس برگزیدہ ہستی کا کمال صفات کی ہمہ گیری اور عمل کی جامعیت ہے۔ جو خدا ان کو تمام عالم کے لیے ہمیشہ کے لیے اسوۂ حسنہ بنانا چاہتا تھا، اس کی مشیت نے ان کو زندگی کے تمام مراحل میں سے گزارا، اور ہر شعبۂ حیات اور ہر مرحلے میں ان کے فکر و عمل کا انداز اس شعبے میں انسانوں کے لیے شمعِ ہدایت بن گیا۔ بے کسی اور یتیمی سے لے کر سلطانی تک انسانی زندگی کے تمام مراحل طے کر ڈالے۔ وہ ایک مزدور کی زندگی بھی بسر کر چکے تھے اس لیے مزدور کے حقوق و فرائض سے بخوبی آگاہ تھے۔ مزدوروں کو دنیا حقیر سمجھتی تھی لیکن سب سے پہلے اس نبی نے اعلان کیا کہ الکاسب حبیب اللہ جائز پیشہ اور مزدوری سے روزی پیدا کرنے والا خدا کا حبیب ہے۔ خدا کا حبیب ہونے سے اونچا درجہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر قسم کے مصائب اور مخالفت کے مقابلے میں اٹل صبر و استقلال، ناکامیوں میں کبھی مایوس نہ ہونا اور کامیابی میں نخوت و غرور کو نفس کے قریب بھٹکنے نہ دینا۔ دیانت داری اور حکمتِ عملی سے ایک کامیاب تاجر کے لیے مثال بننا۔ ایک معمر بیوہ سے شادی کر کے آخر دم تک محبت و وفا کی مثال پیش کرنا۔ کامیاب فاتح بن کر اذیت کیش سنگ دل مجرموں کو لاتثریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دینا۔ صلح و امن کو اپنی

مساعی کی غایت بتلاتے ہوئے اگر جنگ کی ضرورت پیش آجائے تو شجاعت کی داد دیتے ہوئے بھی انسانیت کے اقدار کو نظر انداز نہ کرنا:

با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

ایک مقنن کی حیثیت سے ایسے عادلانہ قوانین پیش کرنا جن کی مثال اس سے قبل موجود نہ تھی۔ زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس کی نسبت بنیادی ہدایت اس اسوۂ حسنہ میں نہ مل سکے۔ یاروا غیار کے ساتھ خوبی کا برتاؤ۔ اختلافِ مسلک کے باوجود دوسری ملتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید۔ تمام افراد و اقوام کے لیے مذہب و ضمیر کی آزادی۔ لا اکراہ فی الدین کا اعلانِ عام۔ سوا ان امور کے جن میں خود فطرت نے تفاوت پیدا کر دیا ہے مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض میں عام مساوات۔ حصولِ علم کی فضیلت اور اس کی ترغیب‘ افزونیِ علم کی مسلسل کوشش اور دعا۔ ارتقائے حیات کا یہ تصور کہ جس شخص کے دو دن ایک جیسے رہے اور اس نے کسی اچھے پہلو میں ترقی نہیں کی تو وہ گھاٹے میں رہا۔ من استوا یوماہ فھو مغبونٌ۔ روحانیت، حکمت اور اخلاق کی اچھی باتیں ان سے پہلے بھی انبیا و اولیا و صلحا و حکما کہتے چلے آئے تھے لیکن ایمان و حکمتِ عمل کی یہ جامعیت کہیں نہیں ملتی:

حسنِ یوسف دمِ عیسےٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

نبوّت ایسے ہی شخص پر ختم ہو سکتی تھی جس کی زندگی کسی پہلو میں تشنہ نظر نہ آئے۔ جو مزدور و کسان کے لیے بھی نمونہ ہو اور حاکم و حکیم کے لیے بھی۔ جو پیکارِ حیات اور اضدادِ افکار و جذبات میں صلح جوئی اور وحدت آفرینی کے ڈھب صرف نظری طور پر نہ بتائے بلکہ نصب العین کو عملی جامہ پہنا کر افراد و اقوام کے لیے بلند ترین نمونہ پیش کرے۔ اس جامعیت کا انسان نہ تاریخ عالم نے بعثتِ محمدیؐ سے پہلے پیش کیا اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے۔ محض

افکارِ عالیہ کے مقابلے میں زندہ عملی مثال کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ انسانوں کے اخلاق اچھے نمونوں سے متاثر ہو کر عمدہ سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اچھے نمونے محمدؐ رسول اللہ ہی کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ ایسے ہی انسان کو انسانِ کامل کہہ سکتے ہیں جس کا کمال ہر شعبۂ زندگی میں نظر افروز اور ہمت افزا ہو اور جس کی جامعیت سے انسانیت کا کوئی شعبہ خارج نہ ہو۔

(ثقافت، اکتوبر ۱۹۵۸ء)

اسلامی تہذیب کا تصوّر

اسلامی تہذیب کا کوئی تصور پیش کرنے سے پہلے، اسلام اور تہذیب ان ہر دو تصورات کو متعین کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب ہوگا کہ اسلام کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ تہذیب کا کیا مفہوم ہے اور شروع ہی میں اس ابہام کو رفع کرنا بھی ناگزیر ہے کہ تہذیب کو بعض اوقات تمدن کا مرادف خیال کیا جاتا ہے لیکن فکر میں وضاحت پیدا کرنے والوں نے ان دو تصورات کو خلط ملط نہیں کیا اگرچہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بھی آسان کام نہیں اس لیے کہ کوئی تہذیب ایک خاص درجۂ تمدن کے بغیر ممکن نہیں اور کوئی تمدن تہذیب سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ انگریزی زبان میں سویلیزیشن اور کلچر کی اصطلاحوں میں بھی یہی ابہام ہے۔ اکثر مصنفوں نے ان کو ہم معنی سمجھ کر اپنی مرضی کے مطابق کبھی یہ لفظ استعمال کر دیا اور کبھی وہ۔ ہماری زبان میں تمدن سویلیزیشن کا قریب تر ترجمہ ہے اور کلچر کا مفہوم تہذیب کا لفظ بہتر ادا کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے تصور میں ہمیں تہذیب اور تمدن دونوں کے عناصر کو شریک کرنا ہوگا، اور یہ بھی غور کرنا ہوگا کہ ایک کا دوسرے پر عمل اور ردِّ عمل کس انداز کا ہوتا ہے۔

سویلیزیشن اور کلچر کے متعلق ہم جب مغرب کے اہلِ فکر کے افکار کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں ایسی گونا گونی نظر آتی ہے جو لطف آفریں اور فکر انگیز تو ہوتی ہے لیکن تعریف و تحدید و تعیین میں کوئی وضاحت پیدا نہیں کرتی۔

مغربیوں کے افکار کے کچھ نمونے آپ کے سامنے بغرضِ تفکر پیش کرتا ہوں۔ میتھو آرنلڈ کہتا ہے کہ کلچر کی مثال ایسی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہو۔ اس

بس شہد بھی ہوتا ہے اور موم بھی۔ شہد میں شیرینی بھی ہے اور غذا، دوا اور شفا بھی۔ قرآن کریم بھی اس کے متعلق کہتا ہے فیہ شفاء للناس۔ چھتے میں جو موم ہوتی ہے اس سے منیرو مستنیر شمع بنتی ہے۔ انسان کو نورِ علم اور شیرینیٔ کردار دونوں کی ضرورت ہے اور کلچر کا لب لباب یہی دو عناصر ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تہذیب تربیت یافتہ فطرت کا نام ہے، اور بہترین تہذیب و تمدن وہ ہے جس کے اندر ہر فرد کو اپنی فطرت کے ممکنات کو معرضِ شہود میں لانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع میسر ہوں۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ اصل تہذیب یہ ہے کہ انسان ملتوں اور جماعتوں کے تعصبات سے بلند تر ہو جائے۔ یہ وہی خیال ہے جس کو غالب نے اس شعر میں ادا کیا ہے:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

کوئی کہتا ہے کہ تہذیب اخلاق احساس کا نام ہے۔ مذہبی شخص کہتا ہے کہ مہذب زندگی وہ ہے جو خدا کی مرضی کے مطابق بسر کی جائے۔ کسی نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انسان کی زندگی اس کو مسلسل کثافت اور جمود کی طرف کھینچتی رہتی ہے اس سے بچنے کے لیے لطیف جذبات، لطیف تاثرات اور لطیف افکار میں زندگی بسر کرنا، تہذیب ہے۔ ایک تصور یہ ہے کہ خارجی فطرت اور باطنی فطرت انفس و آفاق ایک جنس خام ہے اس کے اندر نظم و آئین کی تلاش اور آفرینش اور حسن و جمال اور توازن پیدا کرنا تہذیب ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ تہذیب اچھی عورتوں کے اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک دوسرے مفکر نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ کسی تہذیب کو جانچنے کا بہترین معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس میں عورتوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ بعض مفکرین نے تہذیب و تمدن کے خراب پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرانسیسی حکما میں روسو ان کا امام شمار ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو فطرت نے آزاد پیدا کیا تھا لیکن تہذیب و

تمدن نے اس کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا دی ہیں۔ ایڈورڈ کارپینٹر کی ایک مشہور کتاب، ہمارے طالب علمی کے زمانے میں بہت پڑھی جاتی تھی (Civilization its Cause and Cure) یعنی سویلزیشن ایک مرض ہے جو نوعِ انسان کو لاحق ہو گیا ہے، اب شدید ضرورت ہے کہ اس کی تشخیص کی جائے اور کوئی علاج تجویز کیا جائے۔

کسی کی تہذیب و تمدن پر کڑی تنقید ہے کہ اس کی ترقی میں جمہور کو ذلیل کر کے خواص کو ابھارا جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جہاں ذاتی ملکیت اور خودغرضی نے آہنی دیواریں کھڑی کر رکھی ہوں اس معاشرے کو مہذب نہیں کہہ سکتے۔ انسان کی ایک تعریف یہ ہے کہ وہ آلات استعمال کرنے والا حیوان ہے۔ لیکن آلات کی ترقی سے اعضا نکمے ہوتے جاتے ہیں۔ موٹر نشینوں کی ٹانگیں نیم جاں ہو جاتی ہیں۔ ایک مصلح مزاج مصنف لکھتا ہے کہ کوئی معاشرہ مہذب نہیں ہو سکتا جس میں قید خانے اور پاگل خانے موجود ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہماری تہذیب اور تمدن کو بغور دیکھو تو انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہماری زمین عالمِ ارواح کا دارالمجانین ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ کسی تہذیب کو کامل نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہر تہذیب میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی تخریب کے عوامل بھی پیدا ہوتے ہیں اگرچہ وہ عرصۂ دراز تک آنکھوں سے اوجھل رہیں۔

اس کے متعلق بھی غالب کا یہ حکیمانہ شعر ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

اس افکار پریشانی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تہذیب و تمدن کا مفہوم کس قدر مبہم ہے اور ہیتھے کارلائل اپنے دَور کی مغربی تہذیب کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ تہذیب تین عناصر پر مشتمل ہے بارود، چھاپہ خانہ اور پراٹسٹنٹ مذہب۔ تہذیب و تمدن کے متعلق اعلیٰ درجے کے مفکرین جن کی عقلیت اور روحانیت عام طور پر

لطیف اور دور رس بھی ایسی بھٹکی ہوئی باتیں بھی کہہ گئے ہیں جیسا ایمرسن کا یہ فتویٰ کہ اعلیٰ تہذیب گرم ملکوں میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ سیاست، معیشت اور معاشرت میں آزادی وہیں پنپتی ہے جہاں برف باری ہوتی ہو۔ جس گرم آب و ہوا میں کیلے اگتے ہوں وہاں انسان ہوس پرست اور ظالم ہوتے ہیں۔ ایمرسن جیسا بالغ النظر ادیب اس سے زیادہ اور کہیں نہیں بھٹکا۔ لطیفہ یہ ہے کہ مسلمان مصنفین ابن خلدون کے زمانے میں نہایت سنجیدگی سے اس پر بحث کیا کرتے تھے کہ یورپ والے اس قدر غبی کیوں ہوتے ہیں اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کی سرد آب و ہوا اور برف باری ان کے افکار کو منجمد کر کے عقلی نشوونما کا موقع نہیں دیتی۔

ان افکار اور لطائف سے گزر کر ہم اب اسلامی تہذیب کے تصور کو متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام کا ماخذ قرآن اور اس برگزیدہ ہستی کا کردار ہے جس نے اپنے قول و فعل سے تہذیب کا ایک خاکہ اور نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہاں ہر تہذیب اور تمدن میں امتیاز کرنا پڑے گا۔ اسلام نے پہلے اس قوم کی سیرت کو ڈھالنے کی کوشش کی جس کا تمدن زیادہ تر قبائلی تمدن تھا۔ عرب کے گرداگرد ایسی قومیں تھیں جو ہزارہا سال سے تہذیب و تمدن کی کئی منزلیں طے کر چکی تھیں مگر عربوں کے پاس نہ کوئی علوم تھے اور نہ کوئی فنون۔ فنونِ لطیفہ میں سے فنِ شعر کے سوا ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ قرآن سے پہلے عرب میں کوئی کتاب نہ تھی جسے کسی عرب مصنف نے تصنیف کیا ہو۔

ہندوستان، بابل، مصر، یونان، چین اپنے اپنے دور میں علوم و فنون اور اسباب تمدن میں حیرت انگیز ترقی کے نمونے چشمِ روزگار کو دکھا چکے تھے۔ اسلام کے پاس کوئی علوم نہ تھے جنھیں مہذب قوموں کے سامنے بطور مثالی پیش کر سکتے تھے۔ اہل ایران، اہل روما اور اہل مصر تمدن کے لحاظ سے عربوں کے مقابلے میں ہزارہا فرسنگ آگے تھے۔ اسلام کو پیش کرنے والا انقلابی نبی ان تمدنوں کے اکثر پہلوؤں سے آشنا تھا۔ وہ گرد و پیش کے مذاہب کا بھی

جائزہ لے چکا تھا۔ وہ قدیم تمدنوں کی داستانیں بھی سن چکا تھا، اور ان کے عروج و زوال کا نقشہ بھی اس کی چشم حقیقت شناس کے سامنے تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تمدنوں، تہذیبوں اور مذہبوں کو گھن لگ چکا ہے۔ عشرت کے سامان ظلم سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ ظاہری حسن و جمال کی تہ میں ایک گہری بے دردی ہے۔ انسان ہر جگہ طرح طرح کے استبداد کا شکار ہیں۔ مذہبی استبداد کی وجہ سے انسانوں پر روحانی غلامی طاری ہے۔ اقتصادی لحاظ سے انسان بے بس ہے۔ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ثمر کوئی دوسرا کھاتا ہے۔ مردم خوار مردم خوری کر رہے ہیں اور انسانوں کو محتاج اور غلام بنا رہے ہیں۔ حکمران اپنے آپ کو لوگوں کی عزت اور جان و مال کا مالک سمجھتے ہیں۔ مذہب ہر جگہ بھٹک گیا ہے۔ لوگ رہبانیت کو روحانیت سمجھتے ہیں اور دوسری طرف احبار اور مذہبی پیشوا حکمرانوں اور سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ میں شریک اور معاون ہیں۔ مساواتِ انسانی کا تصور کسی انسان کے ذہن میں بھی نہیں گزرتا۔ مرد عورتوں کو مال اور مویشی کی طرح اپنی جائداد سمجھتے ہیں۔ مذہبوں اور تہذیبوں نے انسانیت پر تذلیل کی مہر لگا رکھی ہے۔ حصولِ علم کے دروازے جمہور پر بند ہیں اس مصلح نے اپنا مشن یہی قرار دیا کہ انسانوں کو ہر قسم کی غلامی اور استبداد سے آزاد کیا جائے اور ایک ایسا معاشرہ پیدا کیا جائے جس کی بنا حریت، عدالت اور رحمت پر قائم ہو۔ لوگوں کو صلح کا پیغام دیا جائے اور جو گروہ صلح جوئی اور اس نئے عادلانہ معاشرے کی راہ میں حائل ہوں اگر وہ تعلیم و تلقین سے راہ پر نہ آئیں تو ان کے خلاف ہر قسم کی قوت کو استعمال کیا جائے۔ انسانی معاشرے میں فتنوں کا سدباب کیا جائے۔ ضمیر کی آزادی کے لیے اگر ضرورت ہو تو جنگ کی جائے مگر دین کے معاملے میں کسی پر جبر نہ کیا جائے۔ نہ جبرِ خفی اور نہ جبرِ جلی۔ حکمرانوں کو یہ بتایا جائے کہ وہ قوم کے خادم ہیں اور حکومت کو ذاتی جلبِ منفعت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ جو گروہ فتنے سے باز رہے وہ اپنے

عقائد پر اپنے انداز سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ ذمی کی جان و مال و آبرو کو مسلمان کی جان و مال اور آبرو کے برابر سمجھا جائے۔ قبیلوں، قوموں اور ملتوں میں سے تعصب اور تفوق کے احساس کو دور کیا جائے۔ اور یہ اعلان کیا جائے کہ کسی عرب کو بحیثیت عرب کسی غیر عرب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، اور نہ ہی کوئی غیر عرب ملت بحیثیت ملت عربوں پر فائق ہے۔ انسانوں میں فرق صرف سیرت اور کردار اور زندگی کے نصب العینوں کے تفاوت سے پیدا ہوتا ہے۔ کوئی گروہ نجات کا اجارہ دار نہیں۔ انسانوں کو یہ تلقین کی جائے کہ وہ توہم آفرینی اور اعجاز طلبی کی بجائے اپنی فطرت اور خارجی فطرت کے مظاہر کا مطالعہ کریں۔

تمام مظاہر فطرت آیاتِ الٰہی ہیں اس لیے فطرت میں آئین کا متلاشی حقیقت میں خدا کا طالب ہے۔ کیونکہ خدائے واحد ہی فطرت کی کثرت میں وحدت آفرین ہے۔ ہر فرد کے لیے ہر قسم کی ترقی کے مواقع مہیا کیے جائیں۔ معاشرہ دولت پیدا کرے لیکن اس کا نگران رہے کہ دولت ظلم سے پیدا نہ ہو، اور وہ چند افراد کے ہاتھوں میں گردش نہ کرتی رہے۔ قیصریت اور کسرائیت کا خاتمہ کیا جائے، لا قیصر ولا کسریٰ کا نعرہ بلند کیا جائے۔ اسلام نے انسانوں کو یقین دلایا کہ جو تمدن ان بنیادوں پر قائم ہوگا وہی انسانیت کا وقار قائم کرے گا۔ وہ انسان کے لیے لامتناہی ارتقا کے دروازے کھول دے گا۔ چنانچہ انسانوں نے دیکھ لیا کہ یہ پیش گوئی سچی تھی۔ اسلام جب حجاز سے نکلا ہے تو اس کے پاس ایک نظریۂ حیات کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ علوم، نہ فنون نہ اعلیٰ درجے کے آلات، نہ سامان عشرت، نہ صنعتوں کے نظر افروز نمونے۔ بقول اقبالؒ:

غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

اس بانگِ درا کے ساتھ یہ قافلہ ایسی تیز رفتاری سے چلا کہ مشرق اور مغرب

کے ڈانڈے مل گئے۔ مسلمان راستہ چلتے ہوئے متمدن قوموں کے علوم و فنون کو اپنا گم شدہ مال سمجھ کر اپناتا چلا گیا۔ اس کے پاس ابتدا میں کچھ نہ تھا لیکن وہ جلد نوعِ انسان کے ہزارہا سال کے ارتقا میں حاصل کردہ علوم و فنون کا وارث ہو گیا۔ اس نے اس دولت کو صرف بچایا اور اپنایا ہی نہیں بلکہ اس کو بڑھایا۔ تمام علوم و فنون میں ایک نئی روح پھونکی جس سے ان کی ہیئت بدل گئی۔ ارسطو اور افلاطون سے بہتر مفکر پیدا کیے۔ اہرامِ فراعنہ اور پارتھینان سے بہتر تعمیریں کھڑی کیں، لیکن ان تعمیروں کا گارا اور چونہ غلاموں کے خون سے نہیں گوندھا گیا۔

لیکن افسوس ہے کہ یہ تہذیب اور یہ تمدن بھی جو حرکت کو برکت سمجھتا تھا اور ارتقا کوش و خلّاق تھا مرورِ ایام سے جامد ہونا شروع ہو گیا۔ حکمرانوں کا استبداد بڑھ گیا اور وہ رعیت کے راعی نہ رہے۔ وہ خداؤں نے کاشت کاروں کو غلام بنا لیا اور دین کی یہ حالت ہوئی کہ:

حرم جویاں درے را می پرستند
فقیہاں دفترے را می پرستند

عالمانِ دین نے یہودی احبار کا رویہ اختیار کر لیا اور برہمنوں کی طرح طبقاتی تفوق کے جذبے کا شکار ہو گئے۔

ابتدائی صدیوں میں مسلمان فقہا تغیرِ حالات کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون میں وسعت پیدا کرتے رہے لیکن بعد کے فقہا میں اجتہاد کی صلاحیت نہ رہی اور یہ پکارنا شروع کیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ جابر سلطانوں کے سامنے کلمۂ حق کہنے والے مفقود ہو گئے۔ علوم کی ترقی رک گئی۔ دین جامد ہو کر افسردہ و پژمردہ ہو گیا۔ حکمرانوں اور علمائے سوء نے مل کر جمہور کو جاہل اور بے بس کر دیا۔ ترقی کی مشعل ان کے دستِ شل سے گر گئی اور دوسروں نے اٹھا لی:

بجھ کے شمعِ ملتِ بیضا پریشاں ہو گئی — اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
دورِ گردوں میں نمو نے سینکڑوں تہذیب کے — پل کے نکلے مادرِ ایام کی آغوش سے

اس وقت مسلمان پس ماندہ ہے۔ اس کے پاس اسباب حیات نہیں۔ علوم و فنون میں اور اصلاح معاشرت میں دوسری قومیں اس سے کوسوں دور نکل چکی ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تہذیب کے اس تصور کا احیا کیا جائے جو ہر قسم کی ترقی اور حریت کا ضامن تھا۔ دین کو اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ اسلام جن رجحانات کا امام تھا ان کو دوبارہ بروئے کار لایا جائے۔ دین کو عقائد کی فروعی جنگ سے چھڑایا جائے۔ انسانوں میں حقوق کے لحاظ سے وہ مساوات قائم کی جائے جس کا نمونہ رسول کریمؐ اور ان کے صحابہ کرام نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تہذیب و تمدن کی بنا عدل و رحمت پر رکھی جائے۔ زندگی میں حسن و جمال پیدا کیا جائے۔ حصولِ علم کا جذبہ پیدا ہو اور انسانیت کا معیار زر و مال نہ ہو۔ گفتار نہ ہو بلکہ کردار ہو۔ اسلامی تہذیب کا تصور ایک لامتناہی ارتقا ہے۔ حیات کا تصور ہے اس کی تکمیل کے لیے تقلید سے زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے اور تحقیق سے زیادہ زندگی کو اس کے مطابق بنانے کی سعیٔ بلیغ۔

بعض ذہنوں میں شاید یہ سوال ابھرے گا کہ اگر غیر مسلم قومیں بھی حیرت انگیز ترقی کر سکتی ہیں تو اسلام کی کیا ضرورت ہے اور اسلامی تہذیب میں کیا خصوصیت ایسی ہو گی جو اس کو دوسری تہذیبوں سے ممتاز کر سکے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انگریز ہم سے بہتر مسلمان ہیں۔ اسلامی صفات میں سے اگر ہمارے پاس پانچ فی صدی سرمایہ رہ گیا ہے تو انگریزوں کی زندگی میں پچاس فی صد موجود ہے۔ انگلستان میں چوربازاری نہیں۔ حاکموں میں رشوت ستانی نہیں۔ ہر فرد کو تعلیم اور ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ کمال درجے کی مذہبی رواداری موجود ہے۔ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ کسی شخص کو محض ذاتی اور مذہبی عقائد کی بنا پر نہ کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ زندگی کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہوتی ہے۔ مملکت نے ہر فرد کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا ہے۔ مملکت ہر فرد کی صحت کی ضامن ہے۔ اسلامی ممالک میں کہیں اس وقت کوئی رفاہی مملکت نہیں۔ ہاں کہیں کہیں ابتدائی کوشش نظر آتی ہے۔ اشتراکی خواہ روسی

ہوں یا چینی، رفاہِ عام کے راستوں پر تیزی سے گامزن ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم انگریزوں کو نمونہ بنا کر اپنی انفرادی اور اجتماعی اصلاح کی طرف قدم اٹھائیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں اشتراکیت اس سے بہتر رہے گی۔ افسوس یہ ہے کہ ہم ان زندہ تحریکوں اور تہذیبوں کے مقابلے میں عہدِ حاضر میں کسی اسلامی مملکت، یا معاشرے کو پیش نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس محض ایک نصب العین اور زاویۂ نگاہ ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی جو ایک جیّد عالم اور پختہ عقیدے کے مسلمان ہونے کے علاوہ ایک انقلاب پسند طبیعت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اسٹالین سے جا ملے اور اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک نصب العینی خاکہ اس کے سامنے پیش کیا۔ سب کچھ سن کر اسٹالین نے پوچھا کہ کونسی اسلامی مملکت اس کو عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ عملاً اس تجربے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ کاربند تو اس پر اس وقت کوئی بھی نہیں۔ لیکن ہمارا ایمان اور مقصودِ حیات یہی ہے اس پر اسٹالین نے جواب دیا کہ جب کوئی قوم اس پر عمل کرے گی تو پھر ہم کوئی رائے قائم کریں گے۔ اگر اس کا جواب ہم یہ دیں کہ اصلی اسلام نے ابتدا میں ایک نمونہ پیش کیا تھا۔ اس سے ہمارے نصب العین کا اندازہ کر لیجیے تو سننے والا کہہ سکتا ہے کہ چودہ سو برس قبل کے حالات اور موجودہ تقاضوں میں اتنا فرق پیدا ہو گیا ہے کہ اس زمانے میں اس تجربے کو دہرایا نہیں جا سکتا۔ تو یہ اعتراض ایک حد تک درست ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ صدیوں سے ہماری ترقی رُک گئی۔ ہم اسلام سے پیچھے ہٹتے گئے اور بعض دیگر اقوام اصلاحی کوششوں میں سرعت کے ساتھ ہم سے آگے نکلتی گئیں:

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

لیکن مایوسی کفر ہے۔ ملتوں کا زوال و کمال ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہزاروں برس کی خفتہ، رجعت پسند اور جامد قومیں یک بیک بیدار ہو کر اپنی کایا پلٹ

چکی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ترقی کی دوڑ میں ہمیشہ کے لیے پس ماندہ رہیں۔ اب اولیں ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے نصب العین میں وضاحت پیدا کریں اور جدید زندگی کے حقائق کو نظرانداز نہ کریں۔ پہلے بھی ہم نے ترقی یافتہ تہذیبوں اور تمدنوں کے ساتھ خذ ما صفا اور دع ما کدر کا عمل کیا تھا۔ اب بھی ہم کو دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھانا اور بہت سی باتوں میں ترقی یافتہ لوگوں کی شاگردی کرنا ہوگی۔ لیکن ہمارا نصب العین اسلام نے متعین کر دیا ہے۔ اس کی ہم وضاحت تو کر سکتے ہیں اور زندگی پر اس کا نیا اطلاق بھی کر سکتے ہیں لیکن اس میں رد و بدل نہ ایماناً ہو سکتا ہے اور نہ عقلاً۔

اسلام اساساً ایمان باللہ اور خدمتِ خلق کا نام ہے۔ وہ انسانوں میں سے مصنوعی تقسیمیں مٹانا چاہتا ہے۔ وہ نسلی یا جغرافیائی یا لسانی قومیت کو زندگی کی اساس نہیں بنا سکتا۔ اسلام حریت اور مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہر قسم کے استبداد کو مٹانا چاہتا ہے۔ وہ انسانوں کو عدالت، رحمت، حکومت اور عفت کو جزوِ زندگی بنانے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ دولت اور قوت کو ذریعہ سمجھتا ہے، مقصودِ حیات قرار نہیں دیتا۔ اسلامی تہذیب کی بنا الحاد نہیں بلکہ توحید ہے۔ وہ زندگی میں طبیعی، اخلاقی اور روحانی جمال پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک طرف رہبانیت اور دوسری طرف دنیا طلبی سے روکتا ہے۔ وہ زندگی کے تمام اچھے نصب العینوں کا جامع ہے۔ وہ غیر قوموں کے کمالات کو اپنانا بھی اپنی توہین نہیں سمجھتا۔ اگر اسلام یہی ہے تو زندگی کا کوئی نصب العین جو انسانی زندگی کو بہتر بنا سکے، اس سے خارج نہیں ہو سکتا۔ ہمارا حال خراب ہے لیکن اگر ہمارا زاویۂ نگاہ حقیقی اسلام کے مطابق ہو تو ہمارا مستقبل ہمارے ماضی سے بھی زیادہ درخشندہ ہو سکتا ہے۔

(ہمایوں، لاہور۔ جنوری ۱۹۵۵ء)

تعدّدِ ازواج

ازدواجی زندگی سے متعلق قرآنی اور اسلامی زاویۂ نگاہ کیا ہے یہ ایک نہایت اہم معاشرتی مسئلہ ہے اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے مسئلہ کے مختلف پہلو بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ تاہم موجودہ حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جن امور کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے ان کو سوال و جواب کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

سوال: قرآن کریم کی تعلیم اس مسئلے کے متعلق کیا ہے؟

جواب: کتاب حکیم میں تعدد ازدواج کے بارے میں دو تین آیات سے زیادہ نہیں ملتیں۔ چار تک نکاح کرنے کی اجازت ایک مخصوص صورتِ حال اور ایک مخصوص سماجی ابتری کے علاج کے طور پر پائی جاتی ہے۔ شروع میں رسولِ کریمؐ اور ان کے جاں نثار پیروؤں اور صحابیوں کو دین کی حفاظت اور رفع فتنہ کے لیے جنگیں کرنی پڑیں۔ مسلمان مجاہدین تعداد میں کم تھے اور مخالفین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان جنگوں میں مسلمان مرد کثیر تعداد میں شہید ہوئے۔ بے کس اور بے بس بیوگان کی تعداد اس ابتدائی معاشرے کا ایک اہم اور حل طلب مسئلہ بن گیا۔ قرآن کریم میں تعدد ازدواج کی اجازت اسی مسئلے کے حل کے لیے دی گئی:

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتمیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلٰث وربٰع فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم ط ذٰلک

اگر تمھیں یہ خطرہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں تمھیں جو پسند آئیں ان سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو۔ ہاں اگر تمھیں یہ اندیشہ ہو کہ تم عدل (بین النساء) نہ کر سکو گے تو بس ایک ہی

ادنیٰ الا تعولوا۔ بیوی ہو یا باندی ہو۔ یہ تمہیں ناانصافی سے بچانے کا قریب تر راستہ ہے۔

اس آیت کی رو سے یہ اجازت کوئی علی الاطلاق اجازت نہیں۔ قرآن کے مدنظر عدل اور رحم ہے اس لیے صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ اس اجازت کا ناجائز استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اجازت عدل کی خاطر ہے اور اگر عدل میں خلل آتا ہو تو پھر ایک ہی بیوی ہونی چاہیے۔ قرآن انسان کی جبلت اور اس کی نفسیات سے بے خبر نہیں، اس لیے یہ بھی واضح کر دیا کہ عدل کا مل نہایت دشوار چیز ہے۔ مال کی تقسیم یعنی ایک سے زیادہ بیویوں کی مالی ضروریات میں عدل لازمی ہے اور ایک انصاف پسند انسان یہ کر بھی سکتا ہے۔ لیکن روابطِ قلبی میں مساوات انسانی اختیار سے باہر ہے لہذا خبردار رہو اور ایسا نہ ہونے پائے کہ طبیعت کا سب جھکاؤ ایک ہی طرف ہو جائے اور دوسری بیوی محروم و معلق رہ جائے

... فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقہ

لہذا تم ایک طرف اتنے نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو معلق چھوڑ دو

سوال: کیا اسلام اجازت دیتا ہے کہ ایک اچھی بھلی صاحب اولاد بیوی کے ہوتے ہوئے کوئی شخص محض اپنی مالی استطاعت کی وجہ سے دوسرا یا تیسرا یا چوتھا نکاح کر لے؟

جواب: اگر کوئی شخص بغیر کسی شدید مجبوری یا ضرورت کے محض اپنے نفس و بدن کی تسکین و تفریح کے لیے ایسا کرتا ہے تو وہ اخلاقاً ایک ناجائز بات کرتا ہے۔

رسول کریمؐ کے اسوۂ حسنہ کو لوگ علی الاطلاق تعدد ازدواج کے جواز میں تو پیش کر دیتے ہیں لیکن اسوۂ حسنہ کے اس قابل توصیف و تقلید پہلو کو نہیں دیکھتے کہ رسولِ کریمؐ کی طویل عائلی زندگی فقط ایک نیک محسنِ اسلام اور قدرشناس بیوی کے ساتھ بسر ہوئی جو عمر میں شوہر سے قریباً پندرہ سال بڑی تھیں۔ رسول کریمؐ کی تمام اولاد میں باستثنائے واحد سب اسی ایک بیوی کے بطن سے ہوئی۔ یہ یقینی بات

ہے کہ اگر وہ رسول کریمؐ کی وفات تک زندہ رہتیں تو رسول کریمؐ اہم معاشرتی اور سیاسی ضرورتوں کے باوجود اسی ایک معمر زوجہ پر قناعت فرماتے۔

سوال: رسول کریمؐ کو امیر مملکت ہونے کے بعد متعدد نکاحوں کی کیوں ضرورت پیش آئی؟

جواب: ان نکاحوں پر ایک ایک کر کے نظر ڈالیے، ان میں سے کوئی بھی خواہش نفس کی شادی نہیں۔ اگر خواہش نفس کا اس میں ذرہ بھر بھی دخل ہوتا تو منتخب خوش رو، جوان، دوشیزگان کا ایک حرم جمع ہو جاتا، جیسا کہ بعد میں مسلمان سلاطین نے کیا۔ رسول کریمؐ کی تندرستی اور غیر معمولی قوت، وصحت آخر تک قائم تھی۔ ذرا اس پر غور فرمایئے کہ ایک معمر بیوی سے اتنی اولادیں ہوئیں دربعد کی دس بارہ امہات المومنین میں سے کوئی اولاد نہیں، کیا اس سے صاف نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ سب نکاح معاشرتی مجبوریوں کی بدولت تھے، اور رسول کریمؐ اصلی عائلی زندگی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ختم کر چکے تھے۔

یہ بات کہ ایک اچھی معقول، دیندار، صاحب اولاد بیوی کے ہوتے ہوئے مرد مومن کو نکاحِ ثانی کی نہیں سوچنی چاہیے اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی موجودگی میں جب حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے دوسرا نکاح کرنا چاہا تو رسولِ کریمؐ اس پر بہت برافروختہ ہوئے۔ کسی کا یہ گمان کرنا کہ یہ اپنی بیٹی پر سوکن لانے کا معاملہ تھا۔ اس رسولؐ کے متعلق ناقابلِ عفو بدگمانی ہے جس کے دل میں اوامر و نواہی کے بارے میں شخصی جذبہ اور ذاتی مفاد مفقود تھا۔

سوال: کیا رسول کریمؐ کے سامنے ایک سے زیادہ نکاح نہیں کیے گئے مگر اس وقت مسلمانوں کو نہیں روکا گیا تو اب کیوں روکا جائے؟

جواب: اس کا جواب وہی ہے کہ ایک قلیل جماعت کو ایک طرف یتامیٰ اور بیوگان کو اپنی پناہ میں لینے کا سوال تھا، اور دوسری طرف اس ملت کی تعداد کو بڑھانا لازمی تھا جسے مسلسل جہاد میں مبتلا رہنا تھا۔ ایسی حالت میں ایسی قوم اگر تعدد ازدواج سے اپنی تعداد کو نہ بڑھائے تو وہ دنیا میں اپنا مشن پورا نہیں کر سکتی۔" تناکحوا د

نکاح کرو اور اپنی تعداد بڑھاؤ۔ اس اہم ضرورت کے پیشِ نظر ایک اچھی ضرورت اور اچھا مشورہ تھا۔ نیا مشن لے کر اُٹھنے والوں کو محض قلتِ تعداد کی وجہ سے مخالف قوتیں مغلوب کر لیتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی اصلی تعلیم اور رسول اللہؐ کا اسوۂ حسنہ سامنے موجود ہونے کی وجہ سے کوئی شخص بیویوں کے معاملے میں غیر عادل ہونے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

سوال: آبادی کے معاملے میں پاکستان کی موجودہ صورتِ حال کیا ہے؟

جواب: پاکستان کے پاس زمین کے دو خطے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا خطہ رقبے میں بہت کم ہے اور اس تھوڑی سی زمین میں جو دریاؤں اور جھیلوں کی زد سے بچ گئی ہے، کوئی پانچ کروڑ انسان جمع ہو گئے ہیں۔ جن کے لیے معمولی خوراک اور تن ڈھانکنے کا مسئلہ بھی حل کرنا دشوار ہے چہ جائیکہ تعلیم و تہذیب و تمدن کے دوسرے تقاضے جو حقیقت میں انسانیت کے لازمی تقاضے ہیں پورے ہو سکیں۔ مغربی پاکستان میں رقبہ بہت زیادہ ہے لیکن سب سے بڑا حصہ یعنی بلوچستان پانچ لاکھ انسانوں کے لیے بھی ادنےٰ سامانِ حیات مہیا نہیں کر سکتا۔ اس خطے میں کوئی ساڑھے چار کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ ایک سال فصل خراب ہونے سے غیر مسلم اقوام کے آگے محض روٹی اور قوتِ لایموت کے لیے دستِ سوال دراز کرنا پڑتا ہے جو کسی غیرت مند قوم کے لیے نہایت شرم ناک بات معلوم ہوتی ہے۔ پورے پاکستان میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں کم ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ ایک عورت بھی ایک مرد کے حصے میں نہیں آتی۔ پاکستان جیسے ملکوں کی شدید ضرورت یہ ہے کہ آبادی کی افزونی کو کم کیا جائے۔ اس وقت یہاں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ اس مقصد کے لیے کیا جائز اور معقول طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ بہر حال پاکستان کی حالت وہ نہیں ہے جو ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی حالت تھی، اس لیے ابتدا میں ازدواج کے معاملے میں جو جواز یا اجازتیں یا ضرورتیں تھیں اور ان کے پیشِ نظر جو طریقِ عمل اختیار کیا گیا تھا وہ موجودہ حالت پر قابلِ اطلاق نہیں ہے۔

سوال: از روئے اسلام عائلی زندگی کی کونسی صورت حیاتِ انسانی کے اقدار کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے قابلِ ترجیح ہوئی۔ شوہر، ایک زوجہ اور ان کی اولاد یا ایک سے زیادہ بیویوں والا گھرانا؟

جواب: فیملی لائف میں سکون و تسکین کا مدار کچھ عدل پر ہے اور کچھ باہمی محبت پر۔ عدل کی نسبت قرآن کریم کا فتویٰ ہے کہ کوشش کے باوجود بھی تعددِ ازدواج میں اس فضیلت پر عمل کرنا نہایت درجہ دشوار ہے۔ باقی رہی محبت تو اس کے اندر رقابت کا جذبہ فطرتِ انسانی کا لازمہ معلوم ہوتا ہے۔ حیاتِ انسانی کا وسیع تجربہ اس کا شاہد ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں باہم رقیب بلکہ دشمن ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بیوی بھی پوری طرح شوہر کے ساتھ جذبۂ وفا نہیں رکھتی۔ سوکن کا جلاپا اور سلگا پا مشہور ہے۔ شوہر کی زندگی ہی میں دو یا زائد بیویوں کی اولاد میں باہمی محبت نہیں ہوتی۔ اگر دشمنی تک نوبت نہ پہنچے تاہم بے گانگی ضرور ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رشک و حسد کی آگ بھڑکتی یا سلگتی رہتی ہے۔ یہ نصیحت کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے عملاً کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اگر شوہر کوئی جائداد چھوڑ جائے تو تقسیمِ جائداد کا جھگڑا دو یا تین بیویوں اور ان کی اولادوں کو عدالت کے کٹہرے پر لے جا کر کھڑا کرتا ہے۔ یہ قصے روزانہ عدالتوں میں پیش آتے ہیں اور وہاں خوب زہر اگلا اور جھوٹ بولا جاتا ہے۔ عدالت کا فیصلہ اگر عادلانہ بھی ہو تو بھی اس سے خصومت ختم نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے ایک میاں اور ایک بیوی اور ان کی اولاد پر مشتمل ایک وحدت بنائی ہے۔ اس وحدت میں شرکت ایسا فساد پیدا کرتی ہے کہ خاندان کا سکون و اطمینان غارت ہو جاتا ہے۔

یہاں مجھے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہوا ایک واقعہ یاد آگیا۔ یہ بزرگ تمام شہر لاہور میں نہایت درجہ ذہین اور باخبر انسان شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ لاہور میں ایک صاحبِ ثروت سادات کے گھرانے میں سے زیور چوری ہو گیا۔ کوتوالی شہر نے بہت تحقیقات کی لیکن چور کا کہیں پتا نہ چل سکتا تھا۔ یہ گھر چاروں طرف

سے محفوظ تھا اور پردے کی شدید پابندی کی وجہ سے کسی مرد ملازم کا اندر آنا جانا نہ تھا۔ آخر کوتوال نے اس بزرگ عاقل سے کہا کہ اس معاملے میں کھوج نکالنے کے لیے آپ کچھ اپنی عقل لگائیے۔ مرد عاقل نے سب قصہ سنا تو وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ باہر سے کسی چور کا اس گھر میں داخل ہو کر زنانہ کمرے کے صندوق میں سے زیور نکال کر لے جانا اور وہ بھی اس طرح کہ گھر میں کسی کو آہٹ بھی سنائی نہ دے محال معلوم ہوتا ہے۔ اس پر یک بیک ان کا ذہن ایک دوسری جانب منتقل ہوا اور پوچھا کہ سید صاحب کی ایک بیوی ہے یا دو ہیں؟ کوتوال نے کہا کہ دو ہیں اور دونوں اسی گھر کے دو حصوں میں رہتی ہیں۔ اس پر بزرگ نے کہا کہ چلو اس مکان پر مجھے اپنے ہمراہ لے چلو۔ وہاں پہنچنے پر کہا کہ مستورات کو کہیں ایک طرف کر دو۔ میں سارے گھر میں پھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کے بعد کہا کہ مجھے ایک موٹا سا ڈنڈا چاہیے۔ کوتوال صاحب مسکرائے کہ کیوں صاحب کسی کی ہڈیاں توڑنے کا ارادہ ہے انھوں نے کہا کہ نہیں کچھ اور مقصد ہے۔ جس تک پولیس والوں کی عقل کی رسائی نہیں چنانچہ ایک موٹا سا ڈنڈا مہیا کیا گیا اور یہ بزرگ کوتوال صاحب کو ہمراہ لے کر اندر چلے۔ ہر کمرے کے فرش اور دیواروں کو زور سے ٹھکرانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک دیوار سے کچھ کھوکھلی سی آواز نکلی۔ کہا کہ کسی کو بلاؤ کہ تیشے سے دیوار کے اس حصے کو اکھاڑ دے۔ جب ایسا کیا گیا تو تمام زیور ایک صندوقچی میں رکھا ہوا اس میں سے برآمد ہوا۔ کوتوال صاحب ششدر رہ گئے اور پوچھا کہ یہ علم غیب آپ کو کہاں سے حاصل ہوا۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ علم غیب نہیں بلکہ عقل حاضر ہے اور انسانی زندگی کا تجربہ ہے۔ کوتوال صاحب نے کہا کہ کچھ مزید تشریح کیجیے کہ ہم بھی اس فراست سے فیض یاب ہوں۔ چنانچہ اس بزرگ نے کہا کہ جب مجھے آپ سے یہ علم ہوا کہ گھر میں چور کا داخل محال ہے اور بیویاں دو ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ دو بیویاں مال کے معاملے میں کبھی شوہر کی وفادار نہیں ہوتیں اور ہر ایک چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے اس سے جو کچھ حاصل ہو سکے کر لیا جائے۔ میں سمجھ گیا کہ جس بیوی کا زیور چرایا گیا ہے اس کی چور

وہ خود ہی ہے اور زیور اس لیے چھپایا ہے کہ شوہر مجبور ہو کہ اتنا زیور اس کے لیے دوبارہ مہیا کرے۔ چونکہ شدید پردہ دار عورت ہے، اس نے ضرور گھر کے اندر ہی چھپایا ہوگا اور گھر کے اندر چھپانے کی قدیم ترکیب دیوار میں خلا کر کے مال چھپانا ہے۔ کوتوال نے کہا کہ حضرت ہم تو یونہی کوتوال بنے بیٹھے ہیں حقیقت میں کوتوال شہر تو آپ کو ہونا چاہیے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے اور یہ بزرگ میرے خاندان کے ایک مشہور صاحبِ فراست شخص تھے اور انھوں نے خود یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا۔ غرضیکہ ایک سے زیادہ بیویوں کا گھرانا فساد کا ایک سرچشمہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اخلاقِ حسنہ اس میں سوخت ہو جاتے ہیں ادنٰے جذبات ابھر پڑتے ہیں۔ عدل و انصاف معدوم، رحم اور محبت مفقود، ہر وقت طعن و تشنیع، سازش کا بازار گرم ہر ایک کا ناک میں دم۔ زندگی میں بھی فساد اور مرنے کے بعد بھی فساد۔

سوال: اگر آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور تعددِ ازدواج میں انسان کی فطرت کا یہ بھونڈا نقشہ ہے تو جہاں اسلام نے اور خراب رسوم و شعائر کی بیخ کنی کی وہاں اسے بھی ایک قلم ممنوع کیوں نہ قرار دیا کہ کسی حالت میں کسی شخص کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ طرزِ بیان کیوں اختیار کیا کہ ایک سے زائد بیویاں کر سکتے ہو بشرطیکہ عدل کو ملحوظِ خاطر رکھو، اگرچہ عدل اس معاملے میں سب سے حد دشوار چیز ہے۔

جواب: یہ صد فی صد درست ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اسی لیے مخصوص اور مستثنےٰ حالات کے لیے گنجائش چھوڑی ہے۔ بعض اوقات جائز طور پر حالات ایسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ چارۂ کار یہی ہو کہ ایک شخص دوسرا یا تیسرا نکاح کر سکے۔ اسلام کی تعلیم کسی ایک سوسائٹی کے لیے نہیں۔ جنگلی اور صحرائی قبائل سے لے کر نہایت ترقی یافتہ تمدن تک کی اقوام طلوعِ اسلام سے لے کر آج تک اسلام قبول کرتی چلی آئی ہیں۔ پھر ان اقوام کو مختلف ادوار میں ہر قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اگر اسلام کے قوانین میں کوئی لچک نہ ہوتی تو وہ مختلف زمانوں میں مختلف حالات اور مختلف

مزاجوں کی اقوام پر حاوی نہ ہو سکتا تھا۔ نہایت ترقی یافتہ اور مہذب اقوام کے افراد کی زندگی میں بھی ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ ان کی مشکل کو نکاحِ ثانی ہی حل کر سکے۔ اور اگر نکاحِ ثانی کو ممنوع قرار دیا جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی وہ اس سے بہت زیادہ جانگداز اور روح فرسا ہوں گی جو نکاحِ ثانی میں پیش آسکتی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم سے قبل جرمنی کی تہذیب اور اس کا تمدن اس کے علوم اور اس کے فنون درجۂ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ خوف ناک جنگ اور پھر شکست نے تہذیب و تمدن کا سب سانچا بگاڑ دیا اور اس متمدن قوم نے ہٹلر جیسے متعصب، مجنون اور بر خود غلط انسان کو اپنا رہبر اور نجات دہندہ تسلیم کر لیا، لیکن انسانی زندگی کی پیچیدگیاں کچھ ایسی ہیں کہ یہ مجنون بھی بعض اوقات ٹھکانے کی بات کہہ جاتا تھا۔ پہلی جنگِ عظیم کے اختتام کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی قوم کو انتقام کے لیے ابھارنا شروع کیا۔ اس وقت کی المانوی حکومت نے اس کو قید کر دیا۔ اسی زمانہ میں اس نے اپنی کتاب "مائن کیمف" (میری پکار) لکھی۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ:

"جرمنوں کے نسلی اسلاف میں تعددِ ازدواج کا رواج تھا اور وہ ان کے حالات میں بہت ٹھیک تھا۔ اب بھی اس جنگ کے بعد اس قوم کے ایسے حالات ہو گئے ہیں کہ تعددِ ازدواج کو جائز قرار دینا پڑے گا، یا کم از کم یہ کرنا پڑے گا کہ بے نکاحی اولاد کے ماتھے پر سے حرامی ہونے کا کلنک کا ٹیکا مٹا دیا جائے۔ جو بچہ اس قوم میں پیدا ہو وہ حلال ہی کا شمار کیا جائے۔" راقم الحروف بھی اس زمانے میں کوئی تین سال تک فلسفے کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی میں رہا۔ میں جس گھر میں رہتا تھا اس کی مالکہ ایک نہایت شریف النفس، مہذّب اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اور مذہبی مسائل پر بھی آزادی سے سوچنے کی عادی تھیں۔ ایک روز اس گھر میں مسلمانوں کے تعددِ ازدواج پر

گفت گو ہوئی۔ میں نے اس خاتون سے کہا کہ میں نے جو تمہارے معاشرے کا حال دیکھا ہے اس کے مدّنظر میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ ان عورتوں کی جو سڑکوں پر اور مکانوں میں عصمت فروشی کرتی پھرتی ہیں، کیا تعداد ہوگی۔ اس نے کہا کہ لاکھوں کی تعداد میں ایسی عورتیں ہیں اور وہ ایسی ہیں جن کو کوئی شوہر نصیب نہیں ہو سکتا۔ میں نے پوچھا کہ اگر ان کو بعض لوگ دوسری بیوی بنا کر ان کے نان و نفقہ کا ذمہ لے لیں اور ان کی اولاد حرامی ہونے سے بچ جائے اور معاشرے میں ان کو ایک معزز مقام مل جائے اگرچہ وہ ہر حیثیت سے ایسا طمانیت بخش نہ ہو جو ایک میاں اور ایک بیوی کی حالت میں ہوتا ہے تو تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہوگی۔ اس خاتون نے جواب دیا کہ دوسری جائز بیوی بن کر ان کی حالت ان کی موجودہ کس مپرسی اور بداخلاقی سے بدرجہا افضل ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ ایسی ہی صورتوں کے لیے اسلام نے اپنے قانون میں گنجائش رکھی تھی۔ تمہاری مغربی اقوام کو ایک زوجگی کے غلط کلیسائی قانون نے بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ مغرب کے ہر ملک میں ناجائز بچوں کے اعداد و شمار شائع ہوتے رہتے ہیں۔ امریکہ میں بھی یہی حال ہے۔ امریکہ کے خطباتی دورے میں مجھ سے اکثر تعدد ازدواج کی بابت دریافت کیا گیا۔ میں نے جواب دیا کہ جس اسلامی ملک سے میں آیا ہوں سو میں ایک گھرانا مشکل سے ایسا ہوگا جس میں دو بیویاں ہوں لیکن اس اجازت کی وجہ سے ہماری قوم ایک بڑی آفت سے بچ گئی ہے۔ یہاں سوسائٹی میں حرامی بچے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں تو کیا سینکڑوں کی تعداد میں بھی نہیں ملتے۔ لاکھ دو لاکھ کے شہر میں اگر دو چار ایسے ہوتے ہیں انھیں انوکھا سمجھ کر تمام شہر میں ان کا چرچا ہوتا ہے۔ اسلام نے خاص حالت میں نکاح ثانی کی اجازت دے کر معصوم بچوں پر کس قدر احسان کیا ہے کہ ان کو حرامی ہونے کی تہمت سے بچا لیا ہے۔

سوال: کون سے موجبات یا محرکات ایسے ہو سکتے ہیں جو نکاحِ ثانی کے لیے جائز شمار ہو سکیں؟

جواب: مثلاً ایک شخص اولاد کا خواہش مند ہے جو ایک فطری اور قابلِ احترام جذبہ ہے اور یہ بات طبی معائنہ سے ثابت ہو جائے کہ اس کی بیوی کے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی یا اس کی بیوی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے وہ حقوقِ زوجیت یا امومت ادا نہیں کر سکتی۔

سوال: اگر جسمانی لحاظ سے کوئی عیب یا نقص نہ ہو لیکن مزاجوں اور طبیعتوں میں ایسا اختلاف ہو کہ زندگی بے لطف ہو جائے تو کیا ایسی حالت میں مرد کو کوئی رکاوٹ ہونی چاہیے کہ وہ کوئی دوسری من پسند بیوی تلاش کر لے؟

جواب: ایسی حالت میں پہلی بیوی کو طلاق دینے کا اسے حق حاصل ہے۔ لیکن اگر شوہر طلاق نہ دینا چاہے اور بیوی طلاق نہ لینا چاہے تو اس صورت میں پہلی بیوی کا معقول اور مناسب نان نفقہ اور اس کے بچوں کی پرورش کا شوہر ذمہ دار رہے گا لیکن دوسری کو پسند کر کے پہلی بیوی کو معلق اور بے بس رکھنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

سوال: کیا کسی ایسے شخص کو جو کسی نامعقول وجہ سے محض خواہشِ نفس یا ذوقِ تنوع سے دوسری شادی کرنے پر آمادہ ہو، اسلامی شریعت روک نہیں سکتی؟

جواب: ہاں ازروئے شرع یا بذریعہ عدالت اسے روک نہیں سکتے۔ لیکن اس کو پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے ساتھ عدل کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ عام طور پر دوسری شادی کرنے والے پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ عادلانہ سلوک نہیں کرتے اس لیے کیا ایک اسلامی مملکت

میں یہ جائز بلکہ لازمی نہیں ہونا چاہیے کہ دوسری شادی کرنے والا عدالت میں درخواست دے اور عدالت میں اس کی پہلی بیوی اور بچے بھی بلوائے جائیں۔ ان کی شکایات اور تقاضے بھی سنے جائیں۔ سب کچھ کہتے سننے کے بعد اگر ایک شوہر دوسری شادی کے ارادہ سے باز نہ آئے تو عدالت پہلی بیوی اور بچوں کے گزارے کا معقول انتظام کرائے، اور حکم صادر کرے کہ اپنی آمدنی میں سے تمہیں اس قدر ان کو دینا پڑے گا، اور ادا نہ کرنے پر تمہارے خلاف عدالت میں چارہ جوئی ہو سکے گی؟

جواب: ہاں چونکہ عام طور پر نکاحِ ثانی کرنے والے اکثر مرد خود اپنے ایمان اور ضمیر سے عدل کو قائم نہیں رکھتے اس لیے اس معاملے میں عدالت کی وساطت اس عدل کے لیے لازمی ہے جو نکاحِ ثانی میں ایک اسلامی فریضہ ہے۔

سوال: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایسے مسلمان مردوں کی جو نکاحِ ثانی کرنا چاہتے ہیں عام ایمانی اور اخلاقی حالت ایسی ہوتی ہے کہ اگر ان کو عدالت میں پیش ہونے پر مجبور کیا جائے اور قانوناً ان کی آمدنی کی عادلانہ تقسیم عدالت کی وساطت سے ہوتی نظر آئے تو وہ آسان راستہ اختیار کریں اور پہلی بیوی کو طلاق ہی دے دیں۔ یہ جوا ہی کندھوں سے اٹھا کر پھینک دیں۔ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ مسلمان مرد کو طلاق دینے سے کون روک سکتا ہے۔ ایسی حالت میں عورت کے لیے دونوں صورتوں میں گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اگر وہ اسے عدل پر مجبور کرتی ہے تو خاوند طلاق دے دیتا ہے۔ طلاق کی صورت میں بے چاری عورت کی بے کسی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کیا وہ بہتر نہیں سمجھے گی کہ عدالت کی وساطت کے بغیر اگر غیر عادلانہ گزارا ہی ملتا رہے تو غنیمت ہے۔ تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ مرد اگر ظلم پر آمادہ ہو تو موجودہ صورت میں عورت کے لیے کوئی راہِ نجات نہیں۔ عورتوں کی یہ بے بسی اور بے کسی کیوں ہے، کیا فطرت نے ان کو بے بس بنایا ہے یا انسانی

معاشرے نے ان کی ایسی حالت کر دی ہے؟

جواب: فطرت اور معاشرہ دونوں نے مل کر اس کی بے بسی میں اضافہ کر دیا ہے۔

سوال: کیا اسلام نے اس صنفِ نازک کی کوئی حمایت نہیں کی اور اس کی فطری بے بسی کو کم کرنے کی کوشش نہیں کی؟

جواب: اسلام نے عورت کی حمایت میں اتنا کچھ کیا کہ بہت ترقی یافتہ اور مہذب ممالک نے بھی ابھی تک عورتوں کی اتنی حق شناسی نہیں کی۔ اسلام سے قبل عورت مملوک تھی۔ اسلام نے اس کو صاحبۂ ملکیت بنا دیا۔ وراثت میں اس کو حصہ دلوایا۔ اس کو اپنے مال کا بلا شرکتِ شوہر مالک اور مختار بنایا۔ نکاح کے وقت اس کو مہر کا حق دار بنایا۔ لیکن عملاً کچھ فقیہوں نے اور کچھ عام مسلمانوں نے ان کے حقوق کو سوخت کر دیا۔ ان کو گھروں میں مجرموں اور قیدیوں کی طرح بند کر دیا۔ ان کی نقل و حرکت پر شدید قدغنیں لگائیں۔ ان کو زندگی کے تمام مشاغل اور کاروبار سے عملاً بے دخل کر دیا۔ اس ظلم میں انگریزوں کی قائم کردہ عدالتوں اور محمڈن لا نے اور اضافہ کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ نہ وہ وارثوں سے اپنا ورثہ لے سکے اور نہ ظالم شوہر سے چھٹکارا حاصل کر سکے، سوا اس کے کہ وہ دینِ اسلام سے خارج ہو کر مرتد ہو جائے۔ چنانچہ بے شمار عورتیں اسی عذاب میں مبتلا ہوئیں۔ ایسی عدالتوں میں اگر کوئی غریب عورت چارہ جوئی کرنا چاہے تو برسوں میں اس کے قضیہ کا فیصلہ نہ ہو۔ بعض اسلامی ممالک میں عورتوں کے حقوق کے معاملے میں شرعی عدالتیں زیادہ سرعت سے اور زیادہ عدل سے کام لیتی ہیں۔ ازدواجی زندگی کے قضیے دو ایک پیشیوں میں طے ہو جاتے ہیں۔ بیوی اور بچوں کے نان و نفقہ کا قصہ ہو یا طلاق و خلع کا معاملہ، چند روز کے اندر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ حالت ہے

کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کا بھرکس نکل جاتا ہے۔ وکیلوں کی فیس اور عدالت کے خرچے ان کے مالی ذرائع کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں، لیکن مہر اور خلع اور وراثت کا جھگڑا ایک قدم آگے نہیں سرکتا۔ آخر میں جو کچھ فیصلہ ہوتا ہے وہ بھی اسلامی شریعت کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ اینگلو محمڈن لا کے مطابق ہوتا ہے۔ جو فقہ کی ایک نہایت جامد شکل ہے۔ اس کی شدید ضرورت ہے کہ فقہی مسائل پر ایک غائر نظر ڈالی جائے اور روحِ اسلام کے مطابق ان کی نئی تشکیل کی جائے۔

مہر کا معاملہ ایک مضحکہ خیز فرضی قصہ بن گیا ہے۔ میاں کی جیب میں دمڑی نہیں کہیں سے قرض لے کر شادی فرما رہے ہیں۔ اور بیس پچیس، پچاس ہزار مہر لکھ دیتے ہیں۔ نہ کسی کا لینے کا ارادہ نہ دینے کا ارادہ۔ کاغذ پر نصف مؤجل اور نصف معجل۔ لیکن حقیقت میں نہ ٹکا نقد نہ ادھار۔ ہاں اگر ناچاقی ہو جائے تو ایک لاطائل طویل مقدمہ بازی کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اگر زوجہ کو حسبِ حیثیت شوہر معقول مہر نقد مل جائے اور وراثت کے معاملے میں بھی اس کی حق تلفی نہ ہو اور وہ اپنے مال سے کچھ منافع پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے علاوہ ہر عورت کچھ علم و ہنر سیکھے جو بوقتِ ضرورت اس کے کام آئے اور اس کی جائز آزادی پر ناجائز پابندیاں نہ لگائی جائیں تو صحیح اسلام کے حدود کے اندر ہی اس کی بے بسی بہت کچھ رفع ہو سکتی ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں نہ معاشرہ اس کی مدد کرتا ہے نہ جامد فقہ اس کی مدد کرتی ہے اور نہ عدالتیں اس کی دادرسی کرتی ہیں۔ طلاق کا سدباب کرنے کے لیے اسلام نے جو معاشرتی، نفسیاتی اور اخلاقی ذرائع استعمال کرنے کی تلقین کی تھی اس کو برطرف کر کے اب اسلامی طلاق یہی رہ گئی ہے کہ شوہر صاحب بگڑے یا انھیں کوئی نیا شوق چرایا اور انھوں نے ایک دو تین کر کے بیوی کو بے یار و مددگار سڑک پر ڈال دیا۔ ان تمام حرکتوں نے مسلمانوں کو ازدواج کے بارے میں ایسا بدنام کیا ہے کہ باہر کی دنیا میں کوئی یہ سننے اور

باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اصلی نظام عورت کی حمایت کا ایک لاثانی نظام تھا۔

سوال: کیا یہ بات صحیح نہیں کہ اسلام کی تعلیم میں کچھ رجحانات اور میلانات تھے جو اس وقت کے حجازی تمدن میں فقط ایک حد تک پورے ہو سکتے تھے اور ان کی تکمیل، تہذیب و تمدن کے طویل ارتقا کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔ مثلاً غلامی ہی کو لیجیے۔ اس دور میں اعلیٰ اور ادنیٰ تمام تمدنوں میں غلامی معاشی نظام کا ایک جزو لاینفک تھی اس دور میں کوئی بڑے سے بڑا مصلح اور پیغمبر بھی کسی فوری فرمان سے اس کو منسوخ نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ کوئی متبادل نظام فوراً اس وقت اس کی جگہ نہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ اسلام نے اس تذلیل آدم کو بتدریج منسوخ کرنے کی راہیں سجھائیں، اور جب تک کہ یہ کلیتہً منسوخ نہ ہو، تب تک عدل و رحم کی تلقین کرنے کے علاوہ شریعت میں بھی غلاموں کے اساسی انسانی حقوق کو محفوظ کرنے کے وہ وسائل بتائے جو اس وقت بھی قابلِ عمل ہو سکتے تھے۔ اصل مقصد اور نصب العین یہ تھا کہ یہ قبیح رسم رفتہ رفتہ مٹ جائے اور انسانی دنیا فقط احرار کی دنیا رہ جائے گویا غلاموں کو رکھنے کی اجازت ایک ہنگامی اجازت تھی جو بہت سی عادلانہ شرائط کے ساتھ مشروط کر دی گئی تھی۔ کیا اس زمانے میں تعددِ ازدواج کی اجازت کو اسی پر قیاس نہ کیا جائے جس طرح غلامی کا تمام دنیا میں منسوخ کر دینا منشائے اسلام کے خلاف نہیں بلکہ عین اس کے تقاضوں کے مطابق ہے، کیا قانوناً تعددِ ازدواج کو ناجائز قرار دینا نصب العین کی طرف ایک اہم اقدام نہیں ہو سکتا؟

جواب: آپ کا اندازِ نگاہ اسلام کے متعلق درست ہے لیکن غلامی اور تعددِ ازدواج میں ایک فرق ہے جس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ غلامی کے مٹ جانے سے تمام نوعِ انسان کو ہر حالت میں فائدہ ہے۔ کیونکہ غلامی انسانیت کے ایک بنیادی حقِ حریت میں حائل تھی، لیکن دوسری شادی کی اجازت بعض مخصوص حالات

میں خود انسانیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے باقی رہنی چاہیے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اگر اس اجازت کو قانوناً روک دیا جائے تو کسی جائز ضرورت سے بھی دوسری شادی کرنے والا پہلی کو طلاق دینے پر مجبور ہو جائے گا خواہ وہ اس فراق کا آرزومند نہ ہو، اور نہ ہی بیوی علیحدہ ہونے پر راضی۔ بعض حالتوں میں پہلی بیوی کو طلاق دینا اس کو بالکل بے سہارا چھوڑ دے گا۔ کیونکہ زیادہ تر پہلی بیویاں ایسی ہی ہوں گی جو نہ دوسرا نکاح کر سکتی ہیں اور نہ آزادی سے کچھ روزگار پیدا کر سکتی ہیں۔ تمدن کے اعلیٰ اور ادنیٰ تمام مدارج میں کہیں کہیں نکاحِ ثانی کی اجازت کسی مشکل کا ایک جائز حل ہو سکتی ہے۔ ایک مثال اعلیٰ تمدن سے لیجیے اور ایک ادنیٰ تمدن سے۔ نپولین بوناپارٹ ایک غریب آدمی کا بیٹا اپنی غیر معمولی ہمت اور فراست سے تمام یورپ کا شہنشاہ ہو گیا۔ لیکن یورپ کے مغلوب شاہی خاندان اس کو نو دولتی سمجھ کر دل میں اس سے نفرت کرتے تھے۔ اس کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اگر کسی شاہی گھرانے سے ازدواجی تعلق پیدا کرے تو یورپ کی ایک ہمہ گیر سیاست میں اس کو بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ اپنی پہلی بیوی سے محبت کرتا تھا اور اسے الگ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کلیسائی عیسائیت بیک وقت دو بیویاں رکھنے میں مانع تھی۔ لازماً اس بے چاری کو طلاق دینا پڑی۔ اس کے سوانح میں لکھا ہے کہ طلاق کے وقت میاں اور بیوی دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ یہ اعلیٰ تمدن میں ایک اہم سیاسی ضرورت کے شدید تقاضے کی مثال ہے۔ نپولین جیسے انسان کے ساتھ ساتھ رسولِ اکرمؐ کا ذکر زبان پر لانا سوءِ ادب معلوم ہوتا ہے لیکن ایک اہم مسئلے میں اظہارِ حقیقت کو روکنا بھی جائز نہیں۔ چنانچہ اس امر کی طرف اشارہ کرنا لازمی ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے بعض نکاح بھی خاندانوں اور قبائل کو متحد کرنے کے تقاضے سے عمل میں آئے۔ اس زمانے کے مزاج کے مطابق یہ بلند مقصد اسی انداز سے پورا ہو سکتا تھا۔

اب ایک مثال ادنیٰ ترین تمدن اور معاشرت سے لیجیے۔ افریقہ کے ایک مردم خور وحشی قبیلے میں ایک پادری نے عیسائیت کی تبلیغ کی۔ ایک مردم خور سردار کو عیسائیت پسند آگئی اور وہ باقاعدہ بپتسمہ لے کر عیسائی ہوگیا۔ اس کی بہت کچھ اخلاقی اصلاح ہوگئی اور کلیسا کے بہت سے شعائر میں وہ خلوص سے حصہ لینے لگا۔ عیسائیت کے لحاظ سے ایک خلل اس میں رہ گیا تھا جسے وہ آسانی سے رفع نہ کر سکتا تھا۔ پادری صاحب اس کو برابر کہتے رہتے کہ دو بیویوں کا رکھنا شدید گنہگاری ہے کیونکہ یہ زنا کے مرادف ہے۔ اس کو اپنی دونوں بیویاں پسند تھیں مگر ایک سے کسی قدر زیادہ لگاؤ تھا، اور دوسری سے مقابلتہً کم۔ مبلغ کی مسلسل زجر و توبیخ کا آخر اس پر اثر ہوا، اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ باحسرت ویاس آخر ایک بیوی سے اپنا چھٹکارا کرائے۔ چنانچہ ایک روز اس نے پادری صاحب سے کہا کہ میں نے آخر کار آپ کی نصیحت پر عمل کر ہی لیا ہے اور اب فقط ایک ہی بیوی رکھی ہے۔ پادری نے پوچھا کہ دوسری کو کیا کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے اس کو کھا لیا ہے۔ اب دیکھیے کہ امتناع تعدد ازدواج نے اس سے کیا ظلم کرایا۔ اس کی دبی ہوئی وحشت اور عادت پھر ابھر آئی۔ اگر عیسوی قانون انسان کی فطرت کے مطابق ہوتا اور تمام قسم کے حالات پر حاوی ہوتا جیسا کہ اسلامی قانون ہے تو اس ظلم کی ضرورت پیش نہ آتی۔ غرض متمدن فرنگ کا شاہنشاہ اور فاتح نپولین ہو، یا دورِ وحشت کا انسان سب کی زندگی میں ایسے حالات پیش آسکتے ہیں جہاں دوسری بیوی رکھنا مناسب اور مستحسن ہو اور پہلی بیوی پر ظلم ناروا کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لہذا اسلام اور انسانیت دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ مخصوص حالات کے لیے یہ اجازت باقی رہے۔ قرآن جو عدل پر بے حد زور دیتا ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ اس معاملے میں عدل نہایت ہی دشوار چیز ہے، لہذا عام حالات میں انسان ایک ہی پر قناعت کر لیں تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عام حالات میں عام انسانوں کے لیے وحدتِ ازدواج ہی کو قرین عدل سمجھتا ہے۔ محض لذتِ نفس کے لیے (جو حقیقت میں تعدد ازدواج سے حاصل نہیں ہوتی) کسی مسلمان کا پہلی بیوی اور پہلی اولاد کی زندگی میں

خلل ڈالنا اسلام کے مقصد اور اس کے نصب العین کے منافی ہے۔

سوال: جو لوگ خواہ مخواہ دوسری شادی پر تُلے جاتے ہیں کیا ازروئے شرع ایسے لوگوں کو اس فعل کے ارتکاب سے روکا نہیں جا سکتا؟

جواب: محض قانون کے ذریعہ سے ایسے شخص کو روکنا لاحاصل ہوگا۔ البتہ شرعی عدالت پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے ساتھ معاشی انصاف پر اس کو مجبور کر سکتی ہے۔

سوال: میں پھر اپنا پہلا سوال دہراتا ہوں کہ عدل سے گریز کا راستہ اگر وہ شخص یہ نکالے کہ پہلی کو طلاق دے دے تو طلاق سے تو اس کو عدالت نہیں روک سکتی۔ طلاق کے بعد پہلی بیوی کیا کرے گی۔ وہ معاشی وسائل سے مطلقاً محروم ہو جائے گی۔ وہ مہر تو حاصل کر سکتی ہے لیکن خالی مہر پر کتنے دن بسر کر سکتی ہے؟

جواب: حقیقت یہ ہے کہ محض قانون اور عدالتیں کسی انسان کو مومن اور عادل نہیں بنا سکتیں جب تک مسلمانوں میں حقیقی اسلام اور حقیقی ایمان نہیں ہوگا، ان کو ظلم و جہل سے ہٹانا ناممکن ہے۔

سوال: تو پھر آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس بیماری کو لاعلاج سمجھ کر رفع مرض کے لیے کچھ نہ کیا جائے؟

جواب: نہیں، اصلاحِ عمل سے مایوس ہو کر معاشرے کو اس کی حالتِ زبوں میں چھوڑ دینا کم ہمتی کا کام ہے۔ جہاں تک قانون سے علاج ہو سکتا ہے وہ ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن کسی مسلمان کو اسلامی شریعت کے بدلنے کی جراٴت یا حماقت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلامی شریعت کے بنیادی اور قرآنی اصول حکمتِ بالغہ پر مبنی ہیں ان کو سمجھنے اور ان پر خلوص سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا یہ شریعت کے منافی ہوگا کہ دوسری شادی کرنے کا آرزومند کسی شریعت کی عدالت میں ایک درخواست دے تاکہ اجازت دینے سے پہلے عدالت شریعت کے تمام پہلوؤں کو اس پر واضح کر دے اور اگر عدل میں خلل آنے کا امکان

ہو تو اس کے سد باب کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں اس کی پہلی بیوی اور بچوں کو بھی عدالت میں حاضر کیا جائے تاکہ وہ بھی اپنا نقطۂ نظر ولی کڑی کو پیش کر سکیں؟

جواب: ایسا کرنا شریعت کے ہرگز منافی نہ ہوگا بلکہ اسلام کے مقاصد کے عین مطابق ہوگا۔ اس کا احتمال ہے کہ محض اتنی سی رکاوٹ اور جواب دہی سے گھبرا کر بعض عاقبت نااندیش مرد اس سے باز آجائیں۔ دوسری شادی کا امتناعی حکم عدالت صادر نہیں کر سکتی۔ لیکن جہاں تک ہو سکے عدل پر مجبور کر سکتی ہے۔ میں پھر اپنی تجویز کو دہراتا ہوں کہ ایسے معاملات کے لیے شرعی عدالتیں الگ قائم ہونی چاہئیں کیونکہ عام عدالتیں جن میں ایک معمولی قضیہ برسوں وکیلوں کی حیلہ گیری، ججوں کے تساہل اور انگریزی قانون کی رکاوٹوں کی وجہ سے اٹکا اور لٹکا رہتا ہے اس کام کو سرعت اور خوبی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتیں۔ ایسی عدالتوں میں عورتوں کو بھی بطور اسیسر یا مشیر شریک کیا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا ان خرابیوں کا کوئی سوشل علاج نہیں ہو سکتا؟

جواب: سوشل علاج بہت کچھ کارگر ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عورتیں ایسی انجمنیں اور برادریاں بنائیں جن میں ہر عورت یہ حلف اٹھائے کہ کوئی عورت یا کوئی بیٹی ایسے شخص کے نکاح میں نہیں دی جائے گی جو معقول وجوہ کے بغیر دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہو۔ جو نامعقول عورت ایسے نامعقول شوہر سے نکاح کرے تمام سوسائٹی اس کا بائیکاٹ کر دے۔ جو مرد ناجائز تعدد ازدواج کو سوسائٹی سے مٹانا چاہتے ہیں، وہ ایسے مرد کا سوشل بائیکاٹ کریں جس نے ایسی حرکت کی ہو۔ کسی ایسے شخص کی حمایت و سرپرستی نہ کریں جو اس فعل کا مرتکب ہوا ہو۔ اگر وہ تاجر ہے تو اس کی دکان سے کوئی شخص سودا نہ خریدے، اور کوئی شخص اس سے تاجرانہ کاروبار نہ کرے۔ شاید آپ کہیں کہ ہماری عورتوں اور ہمارے مردوں میں ایسی ہمت اور جرأت کہاں ہے تو میں اس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جس معاشرے میں اخلاقی جرأت کا فقدان ہے اس کو کوئی نظام حکومت یا نظام عدالت درست

نہیں کر سکتا۔ رائے عامہ شدت کے ساتھ اگر کسی فعلِ قبیح کے خلاف ہو جائے تو بہت سے انسان اس سے باز آئیں گے۔ طلاق کے متعلق قرآنی احکام یہ ہیں کہ پہلے یہ قصہ اقربا و احباب اور برادری کے سامنے پیش ہو اور وہ معاملے کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد بھی ایک شخص تلا ہوا ہے تو اس کو روک نہیں سکتے۔ دوسری شادی کے معاملے میں بھی اگر سوسائٹی یا ایک حد تک عدالت کو درمیان میں لایا جائے تو وہ بھی قرآنی منشا کے مطابق ہی ہوگا۔

سوال: اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو اکثر مفکرین اور مصلحین کا خیال ہے کہ حقیقت میں سارا مسئلہ معاشی مسئلہ ہے۔ تمام معاشی وسائل مرد کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ عورت معاشی لحاظ سے تہی اور بے بس ہوتی ہے۔ جب تک یہ صورت رہے گی مرد غالب رہے گا اور عورت مغلوب اور محکوم رہے گی۔ جس کے ہاتھ میں پیسہ ہے وہ اپنی من مانی بات کرے گا اور جس کے پاس نہ کچھ ہے اور نہ کچھ حاصل ہونے کی توقع ہے وہ دستِ نگر ہی رہے گی اور اسے سرِ تسلیم خم ہی کرنا پڑے گا۔ اگر عورت کے ہاتھ میں بھی کچھ ذرائع معاش ہوں تو اس کی خودداری بہت حد تک قائم رہ سکتی ہے؟

جواب: یہ نکتہ اسلامی بصیرت میں موجود تھا اس لیے اسلام نے اپنی شریعت میں یہ قابلِ قدر پہلو رکھا کہ عورت کو ورثہ بھی ملے اور وہ اپنا مہر بھی بوقتِ نکاح حسبِ حیثیت خود وصول کرے، اس کی مالک رہے۔ از روئے اسلام عورت اپنے مال سے خود مختارانہ تجارت کر سکتی اور منافع حاصل کر سکتی ہے۔ شریعتِ حقہ کو پیش کرنے والے کو یہ معلوم تھا کہ انسان کا وقار وہ مرد ہو یا عورت بہت کچھ معاشی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن عورت کا فطری کام ایک اچھی ماں بننا ہے اس کے جسم اور نفس کی تمام ساخت اس حقیقت کی شاہد ہے۔ عورت کا اصلی وظیفۂ حیات یہ ہے کہ وہ شوہر کے لیے باعثِ تسکین ہو۔ صالح اولاد پیدا کرے اور اس کی تربیت میں اپنی قوتوں کا بیشتر حصہ صرف کرے۔ مردوں کی معاشی زندگی میں خواہ

مخواہ کی مساوات طلبی سے تمام قسم کے کاروبار میں شرکت اور وہ بھی اس انداز کی کہ عورت کو اپنے فطری فرائض سے بہت کچھ کنارہ کشی کرنی پڑے اچھے نتائج پیدا نہیں کرسکتی۔ لیکن اگر عورت کو علم و ہنر حاصل ہو اور وہ اپنے فرائض زوجیت و امومت سے عہدہ برآ ہونے کے بعد اس سے معاشی فائدہ اٹھا سکے تو یقیناً عورت کا وقار اس سے بڑھ سکتا ہے اور اس کی بے بسی میں کمی آسکتی ہے۔ علم و ہنر رکھنے والی عورت اپنے نسوانی فرائض بھی بہتر طریقے سے سرانجام دے سکتی ہے اور نامساعد حالات میں معاش بھی پیدا کرسکتی ہے۔ ایسی مثالیں ہر جگہ ملتی ہیں کہ خاوند کی نالائقی کے باوجود عورت نے بال بچوں کی پرورش کا ذمہ لے کر ان کو سنبھال لیا، یا بیوہ ہو جانے کے بعد کاروبار سے یا کسی مناسب ملازمت سے اپنی عزت کو سنبھالے رکھا اور بچوں کی بھی اچھی تربیت کی۔ لیکن بے ضرورت خواہ مخواہ ہر قسم کی معاشی جد و جہد میں اپنی نسوانی قوتوں کو صرف کرنا اور اپنے نسوانی خواص و فضائل کو کھو بیٹھنا خود عورتوں کے حق میں خسارے کا سودا ہے۔

اپنے نسوانی فرائض میں خلل اندازی کے بغیر جو حصول معاش عورتوں کے لیے ممکن اور مناسب ہو اس کے ذرائع پیدا کرنا نہ صرف جائز بلکہ خاص حالات میں فرض ہو جاتا ہے۔

(ثقافت۔ جون ۱۹۵۵ء)

اسلام اور ضبطِ ولادت

پاکستان کے خصوصی مسائل ہیں معاشی ہمواری، آباد کاری، رفعِ بے روزگاری، صحتِ عامہ، توسیع تعلیم و تربیت، حصولِ انصاف کی سہولت اور اخلاقی اقدار کا قیام وغیرہ ہیں۔ یہ سب کچھ انسانیت کا، لہٰذا عین اسلام کا، تقاضا ہے، اسلام کا تقاضا محض روزہ نماز نہیں۔ روزہ نماز زیادہ تر انہی انسانی تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ ان کے بغیر کوئی معاشرہ صالح نہیں ہو سکتا، اور معاشرہ صالح نہ ہو تو اسلام کا نعرہ اور دعویٰ ایک ذہنی فلسفے اور خوش کن شاعری سے زیادہ کچھ نہیں۔

لیکن یہ سارے مسائل ایسے ہیں جن کے حل کرنے کی ضرورت سے کسی مسلمان کو انکار نہیں۔ کوئی انسان کبھی یہ کہنے والا نہ ملے گا کہ "بے روزگاری ضرور رہنی چاہیے۔ معاشی ہمواری کی کوئی ضرورت نہیں۔ آباد کاری بے کار ہے۔ تعلیم اور صحت کوئی ضروری چیز نہیں، اور عدل و انصاف اور اخلاقی اقدار غیر ضروری چیزیں ہیں۔" ان مسائل میں دو رائیں نہیں۔ لیکن اگر انضباطِ عائلی یا "ضبطِ ولادت" کا لفظ زبان سے نکالیں تو یقیناً اس میں دو رائیں سامنے آجائیں گی۔ ایک طبقہ اسے بالکل خلافِ اسلام قرار دے گا اور دوسرا اس میں کوئی دینی مضائقہ نہ تصور کرے گا۔

یہ عجیب بات ہے کہ دوسرے تمام مسائل میں ہماری قوم یک زبان و ہم آہنگ ہے۔ لیکن جس چیز پر ان سارے مسائل کا ۸۰ فی صد حل موقوف ہے، اس میں قوم کی دو رائیں ہیں۔ یوں تو ساری دنیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اکثر اقوامِ عالم کے لیے ایک انتہائی اہم مسئلہ بن گئی ہے اور اکثر ممالک میں لوگ اس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیکن ہماری پاکستانی قوم نے ابھی اسے لائقِ توجہ بھی نہیں سمجھا ہے۔ یہاں کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ولادت اور موت

کے تناسب میں بڑا بل پڑ گیا ہے، اور دونوں میں کوئی توازن باقی نہیں رہا ہے، جس کی وجہ سے آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہی صورتِ حال جاری رہی اور اس پر کنٹرول نہ کیا گیا تو پاکستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے اور معاش، آبادکاری، روزگار، صحت اور تعلیم وغیرہ کے سارے مسائل ہر روز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے جائیں گے۔

اگر ہندوستان، چین، جاپان، ٹرکی، افغانستان، مصر، عرب، مراکش، ایران، شام، عراق وغیرہ سے لاکھوں کی تعداد میں زندہ اور اچھے مسلمان بھائی یہاں پاکستان میں آکر بسنا چاہیں تو حکومتِ پاکستان یقیناً ان پر پابندی لگائے گی اور "جائے تنگ است و مرداں بسیار" یا "یک انار و صد بیمار" کہہ کر انھیں آنے سے روک دے گی۔ لیکن یہی اگر لاکھوں کی تعداد میں "ملکِ عدم" سے ہر ماہ تشریف لائیں تو ان کے لیے دروازہ کھلا رکھا جائے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں۔

بلاشبہ کبھی آبادی بڑھانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے، لیکن اس وقت جب کہ وسائلِ حیات وسیع تر ہوں، سہل الحصول ہوں اور اس کے مقابلے میں افراد کم تر ہوں۔ لیکن اگر معاملہ برعکس ہو تو عقلی و نقلی کسی حیثیت سے بھی آبادی میں اضافہ کیے جانا کوئی دینی خدمت نہیں۔ ہر معاشرے اور ہر حکومت کا فرض ہے کہ وسائلِ حیات اور آبادی میں توازن قائم رکھے۔ اگر کوئی شخص ایک دو فرد پیدا کرے اور وہ معاشرے کے لیے اعلیٰ فرد ثابت ہوں تو یہ اس سے ہزار درجے بہتر ہے کہ بیس اولادیں پیدا کر کے امتِ محمدیہ میں ایسے افراد کا اضافہ کرے جن کو رہنے کے لیے مکان میسر نہ ہو۔ جن کی ضروریاتِ زندگی پوری نہ ہو سکتی ہوں، جن کی صحت برقرار رہنے کا کوئی انتظام نہ ہو۔ جن کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہو اور جو اپنی آئندہ زندگی میں در در کی ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ بھیک مانگتے پھریں۔ چوریاں کرتے پھریں اور اپنی ذہنی و اخلاقی گراوٹ سے سوسائٹی کو خراب کر کے ملک و قوم کو رسوا کریں۔ یہ نہ کوئی دینی خدمت ہے، نہ قومی اور ملکی۔ نہ اخلاقی، نہ معاشی اور سیاسی، نہ عقلی، نہ علمی اور ذہنی۔

عہدِ نبوت میں ضبطِ ولادت کا ایک ہی طریقہ رائج تھا جسے "عزل" کہتے ہیں۔ اور اب اس کے کئی طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ تفصیلات میں جانا شاید تہذیب کے مطابق نہ ہو گا۔ اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ نئے طریقے ایسے ہی ہیں، جیسے کسی مرض کی دوا عہدِ رسالت میں کچھ اور تھی اور اب بہت سے نئے علاج ایجاد ہو گئے ہیں۔ اگر نئے طریقہ علاج سے فائدہ اٹھانا خلافِ سنت نہیں، اور یقیناً نہیں، تو ضبطِ ولادت کے نئے طریقوں سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی دینی قباحت نہیں۔ اب ذرا "عزل" کے متعلق کچھ احادیث سنیے:

بخاری شریف میں حضرت جابر سے یہ روایت ہے کہ:

کنا نعزل علی عھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم والقرآن ینزل۔	ہم عہدِ نبوت میں عزل کیا کرتے تھے اور قرآن نازل ہو رہا تھا (یعنی اگر عزل کرنا جائز نہ ہوتا تو قرآن میں اس کی ممانعت ضرور آتی)

حضرت ابو سعید خدری سے بخاری ہی میں ایک دوسری روایت یوں ہے:

کنا نعزل فسالنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال او انکم لتفعلون؟ قالھا ثلثا ما من نسمۃ کائنۃ الی یوم القیمۃ الا ھی کائنۃ۔	ہم عزل کیا کرتے تھے۔ پھر حضورؐ سے اس بارے میں دریافت کیا تو حضورؐ نے تین بار پوچھا کہ کیا تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ پھر فرمایا کہ قیامت تک جو روح آنے والی ہے وہ تو آ کر ہی رہے گی۔

اس حدیث میں کچھ تعجب کا اظہار ہے اور کچھ حقیقت کا اظہار۔ یعنی آنے والی روح تو آ کر ہی رہے گی۔ لیکن یہ ایسا ہی جیسے کہا جائے کہ "جسے مرنا ہے اس کی موت تو آ کر ہی رہے گی۔" اس سے جس طرح یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ کوئی بیمار ہو تو علاج نہ کیا جائے۔ اسی طرح اس فرمان سے کہ "آنے والی روح تو آ کر ہی رہے گی" یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ ضبطِ ولادت ناجائز ہے۔ عدم جواز کے لیے سیدھا اور صاف طریقہ گفتگو تو یہی ہو سکتا تھا کہ "ایسا نہ کیا کرو اور اس سے باز آ جاؤ۔" لیکن اس کی

ممانعت نہ کہیں قرآن میں ہے نہ کسی حدیث میں۔ بلکہ مسلم کی روایت میں تو صاف الفاظ یہ ہیں کہ:

کنا نعزل علی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبلغہ ذالک فلم ینھنا۔	ہم لوگ عہدِ رسالت میں عزل کیا کرتے تھے حضورؐ کو یہ اطلاع ملی مگر ہم لوگوں کو اس سے منع نہ فرمایا۔

عام فقہا نے صرف اتنی احتیاط رکھی ہے کہ آزاد (حرہ) زوجہ سے اذن لے کر عزل کیا جا سکتا ہے۔ مگر امام شافعی اس کے لیے کسی اذن کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے

بہرکیف یہ مسلم ہے کہ عزل کی کوئی ممانعت نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیث میں پس اگر عزل جائز ہے تو ضبطِ ولادت کے تمام نو ایجاد طریقے بھی جائز ہی ہونے چاہئیں عزل کا مقصد یہ ہے کہ جرثومہ حیات کو رحم میں نہ پہنچنے دیا جائے۔ خواہ اسے مار کر ہو یا ضائع کر کے یا درمیان میں کوئی چیز حائل کر کے۔

اگر ایک جرثومہ حیات کو ضائع کرنا ناجائز ہوتا تو سرے سے وظیفہ ازدواج ہی کو ناجائز قرار دے دیا جاتا۔ کیونکہ ہر بار کئی ارب جرثومہائے حیات (Sperms) ضائع ہوتے ہیں، اور استقرارِ حمل کے بعد تو بلاشبہ اربوں جراثیم حیات ضائع ہی جاتے ہیں۔ پس یہ یقینی طور پر جاننے کے باوجود کہ صرف ایک ہی جرثومہ انسان بن سکتا ہے، اور وہ بھی قسمت سے جس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ سرے سے وظیفۂ زوجیت ہی کو ناجائز ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات ضبطِ ولادت کا شمار واجباتِ شرعیہ میں ہوتا ہے۔ مثلاً اگر یہ معلوم ہو کہ استقرارِ حمل سے عورت کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی تو اس ایک کی جان بچانے کے لیے اربوں جراثیم حیات کا اتلاف واجبات میں سے ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ:

ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما (۴: ۲۸)	اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو۔ اللہ تم پر مہربان ہے۔

پس اگر ایک عورت کی جان بچانے کے لیے اربوں جراثیم حیات کو ضائع کرنا درست ہے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنی چاہیے کہ پورے معاشرے کو معاشی و معاشرتی تباہی سے بچانے کے لیے بھی ضبط ولادت نہ فقط جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہے اور حکومت یا معاشرے کا فرض ہے کہ وہ ضبطِ ولادت کے لیے تمام ممکن سہولتیں بہم پہنچائے۔ جو حکومت موجودہ افراد کا انتظام نہ کر سکتی ہو وہ کم از کم اتنا تو کر سکتی ہے کہ ان مشکلات میں مزید اضافے سے لوگوں کو بچائے۔

بعض حضرات ضبط ولادت کی ممانعت اس آیت سے مستنبط فرماتے ہیں:

لا تقتلوا اولادکم خشیۃ	اپنی اولاد کو محتاجی کے خوف سے قتل نہ کرو
املاق نحن نرزقھم وایاکم	ان کو روزی ہم دیں گے اور تم کو بھی ہم ہی دیتے
ان قتلھم کان خطأً کبیراً	ہیں۔ ان کو قتل کرنا شدید غلطی ہے۔

(۱۷:۳۱)

اگر واقعی جرثومہ حیات کو ضائع کرنا قتلِ اولاد ہے تو ہر وظیفۂ زوجیت کے بعد والدین کو اپنی اربوں اولاد کے ضائع ہونے پر ماتم کرنا چاہیے۔ اور پھر اگر جراثیم حیات کو ضائع کرنا بھی قتل اولاد کے جرم میں داخل ہوتا تو قرآن عزل کرنے والوں کو قاتلین اولاد قرار دیتا، اور کبھی تو حضورؐ نے عزل کو قتل اولاد قرار دیا ہوتا۔ جب یہ سب کچھ نہیں تو اپنی طرف سے قتل جرثومہ کو قتلِ اولاد بنانے کا کسی کو کیا اختیار ہے، اور پھر ان انبیا و اولیا کے متعلق کیا فتویٰ لگایا جائے گا جنھوں نے تجرد کی زندگی گزاری؟ کیا ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اربوں ہونے والے انسانوں کو وجود میں آنے سے روک دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ ضبطِ ولادت قتلِ اولاد سے بالکل جدا گانہ شے ہے۔ قتل اولاد تو اولاد ہونے کے بعد ہوتا ہے اور ضبطِ ولادت وجودِ اولاد سے پیشتر کا احتیاطی عمل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آبادی زیادہ ہو جانے کے بعد قدرت امراض یا وبا یا جنگ مسلط

کرکے توازن پیدا کرلیتی ہے۔ لیکن قدرت کو یہ توازن پیدا کرنے کا موقع بہم پہنچانا کون سی نیکی ہے؟ انسانوں کو پیدا کرکے جنگ یا وبا سے ختم کرانا زیادہ بہتر ہے یا اس سے پہلے ہی جراثیم حیات کو ختم کر دینا؟

یہاں ایک ضروری نکتہ یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ضبطِ ولادت سے مراد صرف جراثیم زندگی یعنی مادّہ کی اضاعت ہے۔ استقرار حمل کے بعد اسے ساقط کرنا ایک مجرمانہ فعل ہے۔ اس کو اگر قتل اولاد نہ بھی قرار دیا جائے تو قتل اولاد سے اس کی سرحدیں ضرور ملتی ہیں۔ مادّۂ تولید کے کسی جرثومے کے متعلق یقینی طور پر انسان بن جانے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن قرار یافتہ حمل کے متعلق انسان بننے کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے بجز اس کے کہ وہ کسی مرض کی وجہ سے بلا ارادہ ساقط ہو جائے۔ ایسے مواقع پر اسے اسقاط سے بچانا انسانی فرض ہے، اور وہ بھی صرف اس آسکنے والی روح ہی کی خاطر نہیں، بلکہ حاملہ کی جان کی خاطر۔ یہ حقیقت کون نہیں جانتا کہ جنین کا اسقاط وسقوط، یعنی خود بخود گرنا یا عمداً گرانا، دونوں ہی عورت کے لیے سخت مضر ہیں اور دونوں کی زندگی کا تقاضا اسے محفوظ رکھنا ہے۔ اس لیے ضبطِ ولادت میں اسقاطِ جنین کے جواز کا ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پیدا ہوتا۔

اصل قتل وہی ہے جو زندہ پیدائش کے بعد کیا جائے۔ عربوں میں کہیں کہیں اس قسم کا رواج تھا جس کی قرآن نے واضح ممانعت فرمائی۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب تین وجہ سے قتلِ اولاد کیا کرتے تھے:

۱۔ معاشی تنگی۔ اس کے لیے قرآن نے فرمایا کہ "لا تقتلوا اولادکم خشیة املاق۔"

۲۔ خود ساختہ شرم وحیا۔ اس کا تعلق اولاد اناث یعنی لڑکیوں سے تھا۔ جس کا ذکر قرآن نے یوں کیا ہے: "واذا بشر احدھم بالانثی ظل وجھہ مسوداً وھو کظیم یتواری من القوم من سوء ما بشر بہ ایمسکہ علی ھون ام یدسہ فی التراب الا ساء ما یحکمون۔" (۱۶: ۵۸، ۵۹) یعنی ان میں کسی کو جب لڑکی

پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ اندر ہی اندر گھٹنے لگتا ہے۔ اس بشارت سے اسے جو رنج پہنچتا ہے اسے وہ لوگوں سے چھپاتا پھرتا ہے، اور سوچتا ہے کہ اس ذلت کو اٹھائے پھرے یا اسے پیوندِ زمین کر ڈالے۔ آگاہ رہو کہ ان کے یہ منصوبے بہت ہی برے ہیں۔

اور اسی چیز کا ذکر اس آیت میں بھی ہے: "واذا الموؤدة سئلت بای ذنب قتلت" (۸۱: ۸، ۹) یعنی زندہ درگور کی ہوئی بچیوں سے یہ پوچھا جائے گا کہ انھیں کس جرم میں قتل کیا گیا تھا۔

۲۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے اولاد کو بھینٹ چڑھانا۔ یہ کسی ایک صنف کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ ذکور و اناث دونوں کے ساتھ یہ ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں اسی کا ذکر اس آیت میں ہے: "وکذٰلک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم" الخ ..... (۶: ۱۳۷) یعنی یونہی بہتیرے مشرکوں کی نگاہ میں ان کے معبودوں نے قتلِ اولاد کو ایک قابلِ قدر کام بنا کر رکھ دیا تھا۔

عربوں میں یہی تین طریقے قتلِ اولاد کے رائج تھے اور ان سب کا تعلق اس اولاد سے تھا جو زندہ پیدا ہو چکی ہو۔ مادۂ تولید کو ضائع کرنے سے ایک کا بھی تعلق نہیں تھا اب دیکھیے بات کا نقشہ یوں بنا کہ

ایک طرف زندہ اولاد کو قتل کیا جاتا ہے اور دوسری طرف عزل و ضبطِ ولادت کیا جاتا ہے۔ دونوں فعل اللہ اور رسولؐ کے سامنے ہیں۔ مگر ایک کے متعلق اللہ اور رسولؐ دونوں واضح اور غیر مبہم ممانعت کرتے ہیں اور دوسرے کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم آیا ہے نہ حدیث میں۔ فرمائیے دونوں کے فرق کے بارے میں اب آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ کیا اب بھی آپ ضبطِ ولادت کو قتلِ اولاد قرار دیں گے؟

ہمیں ایک حقیقت کو اور بھی واشگاف کرنے کی اجازت دیجیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں بے سہارا اولاد پیدا کرنا قتلِ اولاد سے کم سنگین جرم نہیں۔ ایسی اولاد پیدا کرنا جس کی دینی، جسمانی، اخلاقی، روحانی، ذہنی، علمی، عملی، معاشی اور

معاشرتی تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو، دینی، اخلاقی اور عقلی لحاظ سے ناقابلِ معافی جرم ہے۔ عرب کے وحشی جس درندگی کے ساتھ اپنی اولاد کو قتل کرتے تھے اس کی تکلیف چند منٹ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ موت ساری تکلیف کا خاتمہ کر دیتی تھی۔ لیکن جس طرح کے بے سہارا بچے ہماری نانِ شبینہ کی محتاج بھوکی اور ننگی قوم کے اکثر افراد پیدا کر رہے ہیں وہ صحیح معنوں میں زندہ درگور کرنے کے مترادف ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ اس لیے کہ ایسی اولاد زندگی بھر موت کی ہچکیاں لیتی رہتی ہے اور پھر بھی نہیں مرتی۔ وہ "لا یموت فیہا ولا یحییٰ" کی روح فرسا کیفیت میں زندگی کے دن گزارتی ہے۔

معاشی تنگی کی وجہ سے عزل یا ضبطِ ولادت کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جو احمد بن حنبل نے اسامہ بن زید سے یوں روایت کی ہے:

ان رجلاً جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی اعزل عن امراتی .... فقال صلی اللہ علیہ وسلم لم تفعل ذالک ؟ فقال الرجل اشفق علی ولدھا او اولادھا۔ فقال علیہ السلام لو کان ضاراً ضر فارس والروم۔

ایک شخص نے حضورؐ کے پاس عرض کیا کہ میں اپنی عورت سے عزل کرتا ہوں۔ حضورؐ نے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ عرض کیا کہ اس کی اولاد کا خطرہ محسوس کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا اگر یہ مضر ہوتا تو فارس و روم کے لیے بھی مضر ہوتا۔

امام شوکانی "نیل الاوطار" میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن الامور التی تحمل علی العزل الفرار من کثرۃ العیال۔

یعنی عزل پر مجبور کرنے والی چیزوں میں ایک چیز کثرتِ اولاد سے بچنا بھی ہے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معاشی تنگی میں مزید اضافہ ہونے کے اندیشے سے ضبطِ ولادت پر عمل کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ چنانچہ ایک بار حضرات علیؓ و زبیرؓ و سعیدؓ اور دیگر صحابہ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے کہ

عزل کا ذکر چھیڑا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: "لا باس بہ" اس میں کوئی حرج نہیں۔

ان حقائق کے بعد چند اور ضروری باتیں بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ "نسل کشی" کی فراوانی کو روکنے کا مطلب "نسل کشی" نہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ موت و ولادت میں ایک توازن پیدا کیا جائے۔ موت و ولادت ہی میں نہیں بلکہ اسبابِ حیات اور آبادی میں بھی توازن کو برقرار رکھا جائے، اور صرف اسی قدر کافی نہیں بلکہ جو آبادی زندہ موجود ہے اس کو زندہ رکھنے کے لیے تمام وسائلِ حیات مہیا کیے جائیں، اور تمام سامانِ زندگی میں خاطر خواہ اضافہ کر کے معاشی تنگی کو دور کیا جائے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا علاج تنہا حمل روک یا برتھ کنٹرول نہیں۔ ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کرنی لازمی ہے کہ سامانِ زلیست کو فراواں کیا جائے ضبطِ ولادت تو کوئی گناہ نہیں مگر زندوں کے لیے اسبابِ زلیست مہیا نہ کرنا بلاشبہ گناہِ عظیم ہے۔ اور اس کی سرحدیں قتلِ انسان سے ملی ہوئی ہیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مصر کی اخوان المسلمون کے ایک معزز رکن البہی الخولی نے "تحدیدِ نسل" پر ایک رسالہ شائع کیا ہے جس کا نام ہے "المراۃ بین البیت والمجتمع" (عورت گھر اور سوسائٹی کے درمیان)۔ اس میں بھی ان احادیث کے حوالے موجود ہیں جو ابھی ہم نے نقل کیے ہیں اور مؤلف ممدوح نے ضبطِ ولادت کو بالکل جائز قرار دیا ہے۔ بلکہ بعض حالات میں اسے ضروری بھی بتایا ہے۔ اس کے علاوہ خالد محمد خالد نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے "من ھنا نبدا" (ہم یہاں سے شروع کرتے ہیں)۔ اس میں انھوں نے بھی خولی کی تائید کی ہے۔ اس رسالے کی آٹھ اشاعتیں ہو چکی ہیں۔ اس میں انھوں نے ایک استدلال یہ بھی کیا ہے کہ حضور اکرم صلعم اکثر یہ دعا پڑھتے تھے کہ

"اللھم انی اعوذ بک من جھد البلاء" یعنی اے اللہ میں "جہد بلا" سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ یہ "جہد بلا" کیا چیز ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ "قلۃ المال وکثرۃ العیال" یعنی معاشی تنگی اور اولاد کی زیادتی۔

مصر سے اور پھر اخوان المسلمون کے ایک رکن کے قلم سے ضبطِ ولادت کا فتویٰ بلاوجہ نہیں۔ وہ ایسے کئی معاملات میں ہم سے آگے ہیں اور زمانے کے تقاضے انھیں سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ نسلِ انسانی کی افزائش کا مسئلہ ان کے سامنے بھی ہے اور اگر آپ غور کریں تو یہ نظر آئے گا کہ مصر کی گزشتہ آویزش و جنگ کا اصلی سبب بھی یہی افزائش نسل تھی۔ اسی نسلی افزائش نے مصریوں کو وسائل معاش اور آبادی کے درمیان توازن پیدا کرنے پر مجبور کیا۔ ادھر تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور ادھر وسائلِ معاش محدود۔ وہ کرتے تو کیا کرتے؟ اس کا حل انھوں نے یہ نکالا کہ پیداوار بڑھانے اور دولت میں اضافہ کرنے کے لیے انھوں نے "اسوان بند" تعمیر کرنے کی اسکیم تیار کی۔ اس میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو یہ خلا یوں پُر کیا کہ نہر سویز کو قومیا کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی صورت نکالی جس کا نتیجہ جنگ و خونریزی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ افزائشِ نسل کی یہ پیچیدگیاں اہل مصر اور اخوان المسلمون کے سامنے تھیں، اس لیے انھوں نے اس بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانے کے لیے ضبط ولادت یا تحدید نسل پر زور دیا۔ ہمارے ہاں کی مذہبی جماعتیں ذرا دیر میں مسائل پر غور کرتی ہیں، اس لیے یہاں اس پر غور ہی نہیں کیا گیا اور جہاں غور کیا گیا وہاں کچھ الٹا غور کیا گیا اور حقائق پر غور کرنے کی بجائے واعظانہ انداز اختیار کیا گیا کہ "جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روزی لے کر آتا ہے لہذا اس کی فکر نہ کرو۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ مادۂ تولید بھی تمھاری ہونے والی اولاد ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

تعجب یہ ہے کہ ہمارے بعض اہل تقدس نے حالت اضطرار میں کئی طرح کی غلط کاریوں کو بڑی فراخ دلی سے جائز قرار دیا ہے، اور جائز ضبطِ ولادت جس کا جواز صریح احادیث سے ثابت ہے قومی اضطرار کی حالت میں بھی ان کے نزدیک جائز نہیں۔

ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ ضبطِ ولادت کا طریقہ معلوم ہونے کے بعد مرد و زن کے ناجائز تعلقات کی بڑی کثرت ہو جائے گی کیونکہ ناجائز ولادت کا خوف نہیں رہے گا۔ ٹھیک ہے۔ لیکن اس کا علاج بدکاری کو روکنا ہے نہ کہ ضبطِ ولادت کی مخالفت

کرنا۔ بدکاری تو اب بھی ہوتی ہے اور کرنے والے اپنا راستہ اب بھی نکال لیتے ہیں۔ اسے روکنے کی تدبیریں بھی ضرور کرنی چاہئیں۔ لیکن ذرا اس پر بھی غور کیجیے کہ ضبطِ ولادت میں تو صرف ایک خرابی ہے یعنی ناجائز تعلق کا احتمال، اور بدکاروں کے ضبطِ ولادت نہ کرنے میں دو خرابیاں ہیں، بدکاری بھی اور ناجائز ولادت بھی۔ اور اس کے نتائج یہ ہوتے ہیں کہ بعض عورتیں تو مارے حیا کے خودکشی کر لیتی ہیں، اور بعض گھر سے نکل جاتی ہیں اور بعض اسقاط کرا کے ایک جان ضائع کرتی اور اپنی جان خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔ بعض لوگ بدنامی کے ڈر سے بچے کو کہیں پھینک آتے ہیں یا صندوق میں رکھ کر ریل کے ڈبے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور بعض اسے مار کر قتلِ نفس کے مرتکب ہوتے ہیں، اور اگر قسمت سے وہ نومولود زندہ بچ گیا تو وہ دنیا پر ایک ایسا بوجھ ہوتا ہے جو تنہا بوجھ ہی نہیں ہوتا بلکہ رسوا، بدنام، ہدفِ مطاعن، احساسِ کمتری کا شکار اور سوسائٹی کا ایک ذلیل فرد بن کر رہتا ہے۔ اگر "اہون البلیتین" کا مسئلہ بھی مسلّم ہے تو خود فیصلہ کر لیجیے کہ ان دو بدکاریوں میں کون سی بدکاری کمتر ہے؟ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا بھی ضروری ہے اور ضبطِ ولادت میں بدکاری بڑھنے کا خطرہ بھی ہے۔ اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ "اہون البلیتین" کیا ہے؟ خرابی تو ہر اس بات میں ہو گی جو انسان تجویز کرے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کم خرابی کس میں ہے؟ انسانی فطرت تو یہ ہے کہ خدا کی تجویز کردہ عبادت یعنی نماز تک کو کچھ لوگ ریاکاری کا آلہ بنا لیتے ہیں اور نماز کا بوریا بوئے ریا کا مصدر بن جاتا ہے۔ ایسے ہی دکھاوے کی نماز ادا کرنے والوں کی نسبت قرآن کریم "ویل للمصلین" کہتا ہے یعنی افسوس ایسے نمازیوں پر اور ان کی نماز پر۔ انسان کی بہتری کے لیے خواہ خدا اور اس کا رسول کچھ تجویز کریں یا انسانی عقل اصلاحِ حال کے لیے کوئی منصوبہ پیش کرے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا احتمال ہر حالت میں پایا جاتا ہے۔ حیاتِ انسانی کے اندر ضروری اصلاحات کو محض اس خطرے کی وجہ سے نہیں روک سکتے کہ بعض لوگ ان سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔

(ثقافت۔ اپریل ۱۹۵۷ء)

ملفوظات رومی

مترجم عبدالرشید

یہ مولانا جلال الدین رومی کی ''فیہ ما فیہ'' کا اردو ترجمہ ہے - ''فیہ ما فیہ'' کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں بلکہ مولانا کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو آپ کے صاحبزادے سلطان بہاؤالدین نے آپ کی مختلف مجالس میں محفوظ کیے - مثنوی اور دیوان شمس تبریز کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے -

6/75 روپے

مولانا جلال الدین رومی پر خلیفہ عبدالحکیم کی فکر انگیز کتابیں

(۱)

حکمت رومی

یہ ایک بلند پایہ تصنیف ہے جو ماہیت نفس انسانی ، عشق و عقل ، وحی و الہام ، وحدت وجود ، احترام آدم ، صورت و معنی ، عالم اسباب ، اور جبر و قدر جیسے اہم ابواب پر مشتمل ہے ۔ خلیفہ صاحب نے مولانائے روم کے افکار کا دوسرے حکما کے خیالات سے موازنہ کرتے ہوئے ایسی حکیمانہ تشریح کی ہے جو عصر حاضر کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے ذہن و فکر کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے اور ان مباحث کے متعلق صحیح اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کرنے میں مفید و معاون ثابت ہوں گے ۔

3/50 روپے

(۲)

تشبیہات رومی

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی یہ آخری کتاب ہے ۔ اس میں انھوں نے بسط و تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ رومی سا نباض فطرت مبک اور عامۃ الورود تشبیہوں سے کام لے کر فلسفۂ حیات اور کائنات روح کے اسرار و غوامض کس آسانی سے حل کر دیتا ہے ۔ موضوع کی بلندی بجائے خود دعوت فکر ہے ، لیکن انداز بیان کی دلکشی اور سحر طرازی نے الفاظ میں جان ڈال دی ہے ۔

-/8 روپے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور

سرورق زرین آرٹ پریس لاہور میں چھپا